دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک پشاور
دار العلوم حقانیہ
اکوڑہ خٹک کا علمی و دینی مجلہ
ماہنامہ
الحق
بیاد: شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق رحمۃ اللہ علیہ بانی دارالعلوم حقانیہ
مدیر: مولانا سمیع الحق

اے بی سی آڈٹ بیورو آف سرکولیشن کی مصدقہ اشاعت

جلد — ۲۸
شمارہ — ۴-۵
رجب/شعبان — ۱۴۱۳ھ
جنوری/فروری — ۱۹۹۳ء

ماہنامہ الحق اکوڑہ خٹک

بانی: حضرۃ مولانا عبدالحق صاحب رحمۃ اللہ
مدیر معاون، عبدالقیوم حقانی

مدیر: حضرۃ مولانا سمیع الحق صاحب مدظلہ العالی
ناظم - شفیق فاروقی

فون نمبر ڈائریکٹ ڈائلنگ سسٹم
۳۴۰ / ۴۳۵
کوڈ نمبر - ۰۵۲۲۹

اس شمارے کے مضامین

پاکستان میں سالانہ ۸۰/- روپے فی پرچہ ۸/- روپے بیرون ملک بحری ڈاک ۱۲/- پونڈ بیرون ملک ہوائی ڈاک ۱۶/- پونڈ
سمیع الحق استاذ دارالعلوم حقانیہ نے منظور عام پریس پشاور سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ الحق دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک سے شائع کیا۔

ہیڈ بلوکی کا سانحہ یا
قومی شرافت کا جنازہ ــــ

پاکستان میں رمضان المبارک کا آغاز روزنامہ "خبریں" لاہور کی اس روح فرسا، شرمناک اور رسوائے عالم اخلاق سوز واقعہ کی خبر سے ہوا کہ،

" ہیڈ بلوکی! ۳۰ لڑکوں نے لڑکیوں کو اٹھایا اور درختوں کے پیچھے لے گئے اور جتنی زیادتی کر سکتے تھے کی۔ واقعہ بتانے کے قابل نہیں، جس نے بھی ان خونخوار بھیڑیوں کو روکنے کی کوشش کی اسے تشدد کا نشانہ بنایا گیا مزاحمت کرنے والی لڑکیوں پر تشدد کیا گیا وائرلیس پر اطلاع کے باوجود پولیس تین گھنٹے لیٹ پہنچی " (روزنامہ خبریں لاہور، یکم رمضان المبارک)

ہیڈ بلوکی کے اس ایمان سوز اخلاق سوز اور شرمناک واقعہ پر اخباری اطلاعات کے مطابق پوری قوم نے مذمت کی، انہوں نے بھی جو ستائے گئے، انہوں نے بھی جو ستانے والے تھے وہ بھی مذمت کرتے رہے جو ارباب اختیار ہیں حزب اختلاف کے لیے بھی تو مذمت کے سوا اور چارہ نہیں۔

اس اندوہناک اور روح فرسا وقوعہ پر ارباب حکومت سمیت پوری قومی قیادت کی پیشانی شرم سے عرق آلود ہے اور آنکھیں سب کی نیچی ہو گئیں ــــ قوم کا شاید ہی کوئی بدنصیب اور سنگ دل فرد ہو جسکے رونگٹے اس واقعہ سے نہ کھڑے ہوتے ہوں اور کیوں نہ ؟ جوان لڑکوں کا ایک منظم ٹولہ جتھہ، لڑکیوں کی ایک بڑی جماعت پر ٹوٹ پڑے اور بھوکے اور باولے کتوں کی طرح انہیں نوچنے، بھنبھوڑنے اور شرم و انسانیت سے عاری جرم و فحاشی کے ارتکاب میں کوئی عار محسوس نہ کرے۔ لڑکیوں کے تحفظ میں آگے بڑھنے والوں مردوں کو بھی تشدد کا نشانہ بنائے اور قومی وقار اور ملی عظمت کا جنازہ اس دھوم سے تاراج کر دے کہ اسے اپنے احساس زیاں کا احساس بھی نہ ہو۔ بجائے خود ڈوب مرنے کا مقام ہے ــــــ۔

قومی قیادت یا ارباب حل و عقد کے بیانات واقعۃً حقیقت ہیں یا رسمی لیپا پوتی اور رواجی حیاداری کا مظاہرہ ہیں۔ لاریب، ہیڈ بلوکی کے مجرم نوجوانوں کو کوسنا چاہیئے انہیں قرار واقعی عبرتناک سزا دی جانی

چاہیئے۔ جیساکہ یہ منظر دیکھنے والے ایک بوڑھے بزرگ کے تاثرات بھی یہی تھے۔

"یہ لڑکے مسلمانوں کے بچے نہیں یہ حرکتیں دیکھ کر تو کافر بھی شرما جائیں اُف خدا! میں یہ منظر دیکھنے سے قبل مر کیوں نہ گیا میری آنکھیں کیوں نہ پھوٹ گئیں یہ مسلمان کشمیر اور بوسنیا کی بہنوں کی عصمت کے محافظ ہیں جو اپنی بہنوں کی عزتوں کے خود ہی لیٹرے بن چکے ہیں معلوم نہیں مسلمانوں سے کونسی غلطی سرزد ہو چکی ہے جو ایسے بھیڑیے جنم لینا شروع ہو گئے ہیں جو ہوا میری غیرت اور شرم بیان ہی نہیں کر سکتی"۔ (روزنامہ خبریں لاہور یکم رمضان المبارک)

مگر جناب! یہ صرف نوجوانوں کی بات نہیں یہ واقعہ تو پوری قوم اور نئی نسل کے تمام معمارانِ مستقبل کی فکری اور ذہنی ساخت کی غمازی کر رہا ہے چند نوجوانوں پر لعن طعن، انہیں کوسنے، انہیں کیفرِ کردار تک پہنچانے کی باتیں کرنے والی قومی قیادت اور ذمہ دارانِ مملکت خود اپنی عقل وخرد کا ماتم کیوں نہیں کرتے۔ لاریب انہیں مظلوم لڑکیوں کی عصمت دری اور ظلم وزیادتی پر ان سے ہمدردی ضرور کرنی چاہیئے مگر لڑکیاں بھی تو وہی شریف زادیاں تھیں جو مادر پدر آزاد تہذیب مغرب کے متعفن انڈے اور آوارہ لڑکوں کے لیے سامانِ تفریح بننے ہی کے لیے پکنک منانے ہیڈ بلوکی جاتی ہیں یا ساحل سمندر پر جاتی ہیں اگر قابلِ نفرین ہیں تو دونوں، حسب حجاب نہ رہے تھرکتے ہوئے جسم دعوت نظارہ دیں ستھرے سنگترے کی ڈلیاں دیکھ کر منہ میں پانی بھر آئے تو فطرت کا قصور نہیں وہی ہاتھ مجرم ہے جس نے سنگترے کی ڈلیوں کو ننگا کر کے رکھ دیا ہے —— اور اگر ہمدردی کرنی ہے تو دونوں سے کی جائے لڑکیوں کے ساتھ لڑکے بھی ہمدردی کے مستحق ہیں اخلاق اور شرم وحیا دونوں کے لیے ضروری ہے مگر ملکی نظام، قومی معاشرت اور مغربی تمدن کی ترویج اور یلغار نے انہیں ہوسناکی اور حیوانیت کے ہلاکت آفرین راستہ پر ڈال دیا ہے —— کیا تم نے کبھی اپنے تعلیمی ماحول میں غور کیا اپنی کالج کی سوسائٹی پر نظر کی تمہارے نصابِ تعلیم میں کیا پڑھایا جاتا ہے، کبھی ریڈیو اور ٹی وی کو سُنا، اب ٹی وی کے ساتھ وی سی آر کی لعنت بھی تو آپ جانتے ہیں اور پھر آپ کی حکومت نے انتہا کر دی کوئی بس، فلائنگ کوچ اور نائٹ کوچ ایسی نہیں جس میں غلیظ اور ننگی شرم وحیا سے عاری انڈیا فلمیں نہ چل رہی ہوں اب کے دور میں کسی شریف انسان کے لیے پشاور سے لاہور کا سفر ناممکن ہو کر رہ گیا ہے۔

آپ دیکھتے ہیں کہ اب کی اسلامی حکومت میں کن کن غلیظ، متعفن، مریض، فرسودہ اور حیا سوز عملی تجربات کی لیبارٹریوں سے مستقبل کے معمارانِ قوم کو گذارا جا رہا ہے۔

آگ اور پانی کے اس کھیل میں اخلاق باختگی اور فحاشی کی اس یلغار میں اگر نوجوانوں سے ایسے واقعات کا ظہور نہ ہوتا تب حیرت ہوتی اب حیرت کی بات نہیں، قومی قیادت کی عقل پر حیرت ہونی چاہیئے۔

در میانِ قعرِ دریا تختہ بندم کردہ ای
باز مے گوئی کہ دامن ترمکن ہشیار باش

ہیڈ بلو کی کا واقعہ ایک المیہ اور ماتم ہے پورے پاکستان کی غیرت وحمیت کا، قومی اور سیاسی قیادت کے بانجھ پن کا، حکام اور سرمایہ دار طبقوں کی اخلاقی اور ایمانی بے غیرتی و بے حسی کا، پریس کے ذوقِ اشاعتِ فحاشی کا اور پورے ملک کے اخلاقی زوال اور اضمحلال کا۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون)

عبدالقیوم حقانی

خوشخبری

قارئین کو یہ سُن کر مسرت ہوگی کہ ماہنامہ الحق کا شیخ الحدیث مولانا عبدالحقؒ نمبر جو عظیم تاریخی دستاویز اور اپنے موضوع اور جامعیت کے لحاظ ایک مثالی شاہکار ہے رمضان المبارک کے آخری عشرہ میں منظر عام پر آرہا ہے۔ عمدہ کاغذ، ترجمانِ دین والا سائز، مضبوط اور گولڈن جلد بندی، شاندار طباعت ضخامت سابقہ اندازے سے بڑھ کر بارہ سو صفحات ہوگئی ہے تو لازماً اخراجات کا اضافہ بھی ناگزیر تھا۔ لہٰذا الحق اور ترجمان دین کے مستقل قارئین اصل لاگت صرف ۳۰۰ روپے بھیج کر اپنی کاپی محفوظ کرلیں —— جن حضرات کی سابقہ رقم آچکی ہے وہ بھی مزید رقم بذریعہ منی آرڈر بھیج دیں جن جن حضرات کی رقم آتی جائیگی خصوصی نمبر اُنکے نام رجسٹرڈ بک پارسل کے ذریعہ فوراً بھیجا جاتا رہیگا۔

مؤتمر المصنفین ۔ دارالعلوم حقانیہ، اکوڑہ خٹک ضلع نوشہرہ

مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری

فن سیر و مغازی ایک تعارف

سیر و مغازی کا لغوی اور اصطلاحی مفہوم سیرت کے لغوی معنی چال چلن، طور طریقہ اور روش کے ہیں یہ لفظ صاحب سیرت کے پورے احوال زندگی پر بولا جاتا ہے، اور محدثین و مورخین نے کتاب السیرۃ کے نام سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات جمع کئے ہیں، جن میں مغازی کا تذکرہ بھی ہوتا ہے، البتہ فقہاء کے نزدیک سیرت کا یہ وسیع مفہوم نہیں ہے بلکہ جہاد اور غزوات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار و مشرکین کے ساتھ جو معاملہ فرمایا ہے وہ اس کو سیرت سے تعبیر کرتے ہیں جسکی جمع سِیَر ہے، حافظ ابن حجر نے لکھا ہے۔

والسیر جمع سیرۃ، واطلق ذلک علی ابواب الجہاد، لانہا متلقاۃ من احوال النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی غزواتہ[1]	سِیَر لفظ سیرت کی جمع ہے اور اس کا اطلاق جہاد کے ابواب پر ہوتا ہے، کیونکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان حالات سے ماخوذ ہوتے ہیں جو غزوات میں پیش آئے۔

امام ابن الہمام نے اسی مفہوم کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

السیر جمع السیرۃ، وہی الطریقۃ فی الامور وفی الشرع تختص بسیر النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی مغازیہ ولکن غلب فی لسان اہل الشرع علی الطرائق المامور بہا فی غزوۃ الکفار[2]	سِیَر لفظ سیرت بمعنی طور طریقہ کی جمع ہے اور اس کا اطلاق شریعت میں مغازی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال کے ساتھ خاص ہے مگر علمائے شریعت کے نزدیک اس کا اطلاق عام طور سے ان طریقوں پر ہوتا ہے جن کا حکم کفار سے جنگ میں دیا گیا ہے۔

محدثین کتاب المغازی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات درج کرتے ہیں، اور کتاب الجہاد والسیر میں

[1] فتح الباری، کتاب الجہاد والسیر ج ۶ ص ۳ (سلفیہ قاہرہ) [2] فتح القدیر ج ۴ ص ۲۷۷

ان کے طور طریقے اور کفار کے ساتھ معاملات کو بیان کرتے ہیں، اور فقہاء کتاب السیر میں غزوات و جہاد کے فضائل و مسائل، احکام و قوانین اور اس سلسلہ کے جزئیات فقہی انداز میں لکھتے ہیں اور اہل اخبار و تواریخ کتاب السیرۃ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عام حالات درج کرتے ہیں، جن میں سیر و مغازی بھی شامل ہوتے ہیں، سیرت ابن اسحاق اور سیرت ابن ہشام وغیرہ کا یہی انداز ہے۔

لفظ سیرت اس وسیع معنی میں قدیم زمانہ سے مستعمل ہے اور اس نام سے دوسروں کے حالات میں کتابیں لکھی گئی ہیں، عوانہ بن حکم کلبی متوفی ۱۴۷ھ نے کتاب سیرۃ معاویہ و بنی امیہ ابراہیم بن محمد فزاری متوفی ۱۸۸ھ نے کتاب السیر فی الاخبار والاحداث اور واقدی متوفی ۲۰۷ھ نے کتاب السیرۃ اور کتاب سیرۃ ابی بکر و وفاتہ لکھی۔[۱]

غزو، غزوہ اور مغزی (جمع مغازی) کے لغوی معنی قصد، ارادہ اور طلب کے ہیں، اور شرعی معنی کفار سے قتال ہے، ابن حجر نے اس کی تشریح یوں کی ہے۔

واصل الغزو القصد، ومغزی الکلام مقصدہ، والمراد بالمغازی هنا ما وقع من قصد النبی صلی اللہ علیہ وسلم الکفار بنفسه او بجیش من قبله وقصد هم اعم من ان یکون الی بلادهم او الی الاماکن التی حلوها حتی دخل مثل احد والخندق[۲]

غزو کا لغوی معنی قصد و ارادہ ہے اور یہاں مغازی سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بہ نفس نفیس یا اپنے لشکر کے ذریعہ کفار کا قصد و ارادہ کرنا ہے، یہ قصد کفار کے شہروں کا ہو یا ان مقامات کا ہو جہاں وہ اترے ہوں تاکہ اس میں غزوۂ احد اور غزوۂ خندق وغیرہ شامل ہوں۔

بعد میں مغازی کے معنی میں وسعت پیدا ہو گئی اور سیرت کی کتاب کا نام کتاب المغازی پڑ گیا، چنانچہ مغازی عروہ بن زبیر، مغازی ابان بن عثمان، مغازی محمد بن شہاب زہری، مغازی ابن اسحاق، مغازی موسی بن عقبہ، اور مغازی واقدی وغیرہ سیرت کی کتابیں ہیں اور ان میں مغازی کی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔

محدثین و مورخین کتاب المغازی میں اپنے معیار روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال اور آپ کے غزوات و سرایا بیان کرتے ہیں اور فقہاء ان سے جہاد و قتال کے مسائل استخراج کرتے ہیں۔

محدثین و مورخین عام طور سے اپنی کتاب کا نام المغازی یا مغازی الرسول مغزی کی جمع کے ساتھ رکھتے ہیں اسی طرح فقہاء اپنی کتاب کا نام کتاب السیر سیرت کی جمع کے ساتھ رکھتے ہیں۔

---

[۱] الفہرست ابن ندیم ص۱۳۴ و ص۱۳۵ و ص۱۴۴ [۲] فتح الباری، کتاب المغازی ص۲۷۹ ج ۷ (سلفیہ قاہرہ)

علم حدیث اور سیر ومغازی علم السیر والمغازی علم حدیث ہی کا ایک اہم حصہ ہے کیونکہ اس میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان اقوال وافعال اور مقررات سے بحث ہوتی ہے جن کا تعلق غزوات وسرایا سے ہے، امام ابوعبداللہ حاکم نے معرفۃ علوم الحدیث میں ذکرالنوع ثامن کے ذیل میں لکھا ہے۔

هذا النوع من هذه العلوم معرفة مغازی رسول الله صلی الله علیه وسلم وسرایاه وبعوثه، وکتبه الی ملوك المشرکین، وما یصح من ذلك، وما یشذ وما ابلی کل واحد من الصحابة فی تلك الحروب بین یدیه، ومن ثبت ومن هرب ومن جبن عن القتال، ومن کرّ وتدیّن بنصرته صلی الله علیه وسلم ومن نافق، وکیف قسم رسول الله صلی الله علیه وسلم الغنائم، ومن زاد ومن نقص وکیف جعل سلب القتیل بین الاثنین والثلاثة وکیف اقام الحدود فی الغلول وهذا النوع من العلوم التی لا یستغنی عنها عالم[1]

علوم حدیث کی اقسام میں سے آٹھویں قسم ان امور کی معرفت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مغازی وسرایا وبعثات اور مشرک بادشاہوں کے نام آپ کے خطوط میں کیا صحیح ہے کیا صحیح نہیں ہے اور ان غزوات میں آپ کے سامنے صحابہ میں سے ہر ایک نے کیا کارنامہ انجام دیا، کون ثابت قدم رہا، کس نے راہ فرار اختیار کی اور کس نے دین پر عمل کر کے آپ کی نصرت کی اور کون منافق تھا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اموال غنیمت کو کیسے تقسیم فرمایا، کس کو زیادہ دیا کس کو کم دیا اور دو تین مجاہدین میں ایک مقتول کے سلب کے بارے میں کیا کیا اور غلول میں حد کیسے جاری کی، علوم حدیث کی یہ قسم اس قدر اہم ہے کہ کوئی عالم اس سے مستغنی نہیں ہو سکتا ہے۔

خطیب بغدادی نے بھی سیر ومغازی رسول کو علم حدیث میں شامل کیا ہے اور شرف اصحاب الحدیث میں لکھا ہے کہ حدیث میں انبیاء کے واقعات، زہاد اور اولیاء کے احوال بلغاء کے مواعظ، فقہاء کے کلام عرب وعجم کے بادشاہوں کی سیرتیں، امم ماضیہ کے قصے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مغازی وسرایا کی تفصیلات آپ کے احکام وقضایا، خطبے، مواعظ، معجزات، آپ کی ازواج مطہرات، اولاد واصحاب اور ان کے فضائل مناقب، انساب واعمار کا ذکر ہوتا ہے[2]

---

[1] معرفۃ علوم الحدیث ص۲۳۸ [2] شرف اصحاب الحدیث ص۸ (ترکی)

اصحاب الحدیث، اصحاب الفقہ اور اصحاب المغازی

جب پہلی صدی کے خاتمہ اور دوسری صدی کی ابتدا میں احادیث کی تدوین و تالیف کے ساتھ ان کی تبویب و ترتیب شروع ہوئی اور احکام کے استخراج و استنباط کی باری آئی تو محدثین میں مختلف انداز پہ کام ہونے لگا۔ ایک جماعت نے روایت و درایت کے اصول پر احادیث و آثار کو جمع کیا، یہ اصحاب الحدیث اور محدثین کہلاتے، ایک طبقہ نے ان احادیث و آثار سے تفقہ و افتار کے اصول پر احکام و مسائل اور فتاوے مرتب کئے، یہ اصحاب الفقہ والفتویٰ اور فقہار کے لقب سے یاد کئے گئے اور ایک گروہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور آپ کے مغازی و سرایا مدون کیا، یہ اخباری مورخ اصحاب السیر والمغازی کہلائے اور سب سے اپنے اپنے حلقہ میں اپنے کاموں کو آگے بڑھایا، اصحاب الحدیث اور اصحاب السیر والمغازی میں بعض باتوں میں فرق ہے، مولانا ابوالبرکات عبدالرؤف دانا پوری نے "اصح السیر" کے مقدمہ میں اس فرق کو نہایت اچھے انداز میں تفصیل سے بیان کیا ہے، ہم اس کا خلاصہ پیش کرتے ہیں۔

اصحاب الحدیث اور اصحاب المغازی کا فرق

اصحاب حدیث تین امور کو جمع کرتے ہیں —— (۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا فرمایا؛ (۲) آپ نے کیا کیا (۳) آپ کے سامنے یا آپ کے وقت میں کیا کیا گیا؛ اصحاب سیرت بھی ان ہی تین امور کو جمع کرتے ہیں، اس لیے اصل کام دونوں کا ایک ہے اس کے باوجود دونوں میں فرق ہے، اصحاب حدیث کا مقصود بالذات احکام کو جاننا ہوتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے ان کی بحث ضمناً یا التزاماً ہوتی ہے، اور اصحاب سیر کا مقصود بالذات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جاننا ہے، احکام کی بحث ضمناً ہوتی ہے، اس لیے محدثین کی تمام تر قوت اس بحث میں صرف ہوتی ہے کہ اس قول یا فعل کا انتساب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف صحیح ہے یا نہیں؛ اور اصحاب سیرت کو اسی کے ساتھ دو باتیں اور معلوم کرنی پڑتی ہیں، ایک یہ کہ آپ نے کب ایسا کہا یا کب کیا، دوسرے یہ کہ ایسا کہنے یا ایسا کرنے کی وجہ کیا تھی؛ یہ حضرات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کو مسلسل اور مربوط بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں، ان کے اسباب و علل کو بھی جاننا چاہتے ہیں۔

اس فرق کی وجہ سے اصحاب سیرت اور اصحاب حدیث کی دو جماعتیں الگ الگ بن گئیں اور معیار تحقیق دونوں کا جدا جدا ہو گیا۔ محدثین رواۃ کی ثقاہت، تقویٰ اور دیانت کی کمی زیادہ پر مقبول راویوں کی روایات میں اختلاف کے وقت ترجیح دیتے ہیں، اصحاب حدیث ہوں یا اصحاب سیرت دونوں ایسے راویوں کی روایت کو قبول نہیں کرتے جو جھوٹے ہوں یا جن پہ جرح شدید ہوتی ہو۔

اصحاب سیر اور اصحاب حدیث دو جماعت نہیں ہیں بلکہ جتنے اصحاب سیر ہیں وہ اصحاب حدیث بھی ہیں، اسی طرح جو اصحاب حدیث ہیں وہ اصحاب سیر بھی ہیں مگر جب سیرت پر واقعات جمع کرنے پڑتے ہیں اور سیرت کے مقاصد پورے کرنے پڑتے ہیں تو تحدیث و روایت کی شرائط اور وجہ ترجیح میں مناسب تبدیلی کرنی پڑتی ہے، مغازی کے واقعات دونوں لکھتے ہیں مگر دونوں کے لکھنے میں فرق ہوتا ہے مثلاً فتح مکہ سے متعلق محدثین اتنا لکھتے ہیں کہ قریش نے حدیبیہ کے معاہدہ کو توڑا اور بنی خزاعہ پر ظلم کیا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حلیف تھے اس لیے آپ نے حملہ کیا اور مکہ فتح ہوا، لیکن اصحاب سیرت یہ بھی بتلاتے ہیں کہ یہ معاہدہ کتنا اہم تھا، بنی بکر اور بنی خزاعہ کی جنگ چل رہی تھی اس معاہدے کی وجہ سے یہ جنگ رک گئی تھی قریش نے عہد توڑ کر پھر اس جنگ کو مشتعل کر دیا تھا۔

الغرض محدثین کے یہاں جو صحیح روایتیں ہیں اصحاب سیرت کو ان کی ترجیح میں کلام نہیں ہے لیکن ان کو اپنی ضروریات کے لیے اور روایتیں بھی لینی پڑتی ہیں جن کے لیے وہ اپنا معیار الگ قائم کرتے ہیں، بلاشبہ جس طرح حدیث کی کتابوں میں شدید احتیاط کے باوجود بہت سی غلط اور موضوع روایتیں داخل ہوگئی ہیں، سیر میں بھی اسی طرح بہت سے موضوعات ہیں اگر ان کو خارج کر دیا جائے تو دنیا کی کسی قوم کی کوئی تاریخ اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی ہے اس لیے کہ اور کہیں نہ سند ہے اور نہ موضوعات کو جدا کیا جاسکتا ہے[1]

اصحاب المغازی کا روایتی معیار

صحابہ کے بعد تابعین یعنی صحابہ کے تلامذہ کا دور ہے جنہوں نے احادیث آثار اور سیر و مغازی کے واقعات اپنے خاندانی بزرگوں اور استادوں سے روایت کیے ان میں انصار و مہاجرین کی اولاد میں نسبتاً علم زیادہ رہا، ان کے بعد تبع تابعین کا زمانہ آیا جنہوں نے صحابہ اور تابعین کے علم کو آگے بڑھایا، سیر و مغازی کا تمام تر سرمایہ ان ہی اکابر و اصاغر صحابہ تابعین اور تبع تابعین کی روایت سے جمع ہوا ہے[2]

احادیث و آثار کی تدوین سے پہلے یہ تمام حضرات جن میں مردوں کی طرح عورتیں بھی شامل ہیں اپنے گھروں بال بچوں، رشتہ داروں، مسجدوں، محلوں، قبیلوں اور تعلیمی و تدریسی مجلسوں میں سیر و مغازی کے واقعات موقع کی مناسبت سے بیان کرتے تھے اور جب جمع و تدوین کا دور آیا تو ان کی روایتوں کو اصحاب سیر و مغازی نے مدون و مرتب کیا اور اپنے مقاصد کے پیش نظر روایتی معیار میں محدثین کے مقابلہ میں نرمی سے کام لیا۔

اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں، واقعہ افک کا تعلق حضرت عائشہؓ سے تھا، اس کی روایت ان سے ان کے بھانجے عبداللہ بن زبیر نے کی، ان سے ان کے بیٹے عباد بن عبداللہ نے اور عباد سے ان کے بیٹے

---

[1] مقدمہ اصح السیر ص ۲۴، ۲۵، ۲۶، خلاصہ [2] تفصیل کے لیے طبقات ابن سعد ج ص ۳۴۹، ۳۷۷، ۳۷۸

یحییٰ بن عباد بن عبداللہ بن زبیر نے کی، نیز اس کی روایت حضرت عائشہؓ سے ان کی پروردہ اور ان کے علم کی ترجمان عمرہ بنت عبدالرحمٰن نے کی اور ان سے ان کے رشتہ دار عبداللہ بن محمد بن عمرو بن حزم انصاری نے کی، طبری نے تین صفحات میں یہ روایت بیان کی ہے[۱]

ابن عتیق یہودی کے قتل کی روایت عبدالرحمٰن بن کعب بن مالک کی والدہ نے اپنے والد عبداللہ ابن انیس سے سنی اور عبدالرحمٰن نے اپنی ماں سے اور ان سے ان کے بیٹے ابراہیم بن عبدالرحمٰن نے روایت کی[۲] اس سریہ میں عبداللہ بن انیس شریک تھے، غزوہ ذی قرد کے متعدد واقعات حضرت سلمہ بن اکوعؓ کے صاحبزادے ایاس نے اپنے والد سے سن کر بیان کئے ہیں، بیعت رضوان کے بارے میں طبری نے ایک روایت یوں بیان کی کہ مجھ سے محمد بن سعد نے بیان کیا کہ مجھ سے میرے والد نے بیان کیا کہ مجھ سے میرے چچا نے بیان کیا کہ مجھ سے میرے والد نے بیان کیا اور انہوں نے اپنے والد سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کی کہ اہل بیعت کی تعداد پندرہ سو پچیس تھی[۳]

غزوۂ احد کی دو روایتیں یحییٰ بن عباد نے اپنے والد عباد سے کی اور عباد نے اپنے والد عبداللہ بن زبیر سے کی[۴]

غزوہ احد کی ایک اور روایت محمد بن اسحاق نے اپنے والد اسحاق بن یسار سے کی، انہوں نے اس کی روایت عن اشیاخ بن سلمہ یعنی بنی سلمہ کے بزرگوں سے کی۔

غزوۂ خیبر کی ایک روایت محمد بن اسحاق نے عبداللہ بن حسن سے کی اور انہوں نے اس کی روایت عن بعض اھلہ یعنی اپنے خاندان کے بعض لوگوں سے کی[۵]

فتح مکہ کا ایک واقعہ ابن اسحاق نے ابو فراس بن سنبلہ اسلمی سے بیان کیا ہے جس کو انہوں نے عن اشیاخ منھم ممن حضرھا۔ یعنی ان بزرگوں سے روایت کیا ہے جو فتح مکہ میں شریک تھے[۶]

غزوۂ طائف کے سلسلہ میں بلاذری نے ایک روایت مدائنی سے کی، مدائنی نے ابو اسمٰعیل طائفی سے اور انہوں نے اپنے والد سے اور ان کے والد نے عن اشیاخ من اھل الطائف یعنی اہل طائف کے بزرگوں سے اس کی روایت کی[۷]

صلح نجران کی ایک روایت ابن اسحاق نے معاذ بن رفاعہ زرقی سے کی جنہوں نے بتایا کہ حدثنی من شئت من رجال قومی یعنی میری قوم کے لوگوں میں سے میرے ایک پسندیدہ آدمی نے اس کو مجھ سے

---

[۱] تاریخ طبری ص۱۰۲۰ ج ۳۔ [۲] ایضاً ص۳۰ ج ۳ [۳] ایضاً ص۲۰۷ ج ۳، [۴] ایضاً ص۱۶۱ ج و ص۱۰۲۱
[۵] ایضاً ص۱۰۳ ج ۳ [۶] ایضاً ص۱۲۵ ج ۳ [۷] فتوح البلدان ص۵۳۔

بیان کیا ہے[1]

ایک اور واقعہ ابن اسحاق نے اپنے والد سے بیان کیا ہے جس کو انہوں نے عن اشیاخ بنی سلمۃ یعنی بنو سلمہ کے بزرگوں، بڑوں اور بوڑھوں سے سنا تھا[2]

ابن اسحاق نے ایک جگہ لکھا ہے فحدثنی بعض اهل العلم عن رجال من اسلم یعنی بنی اسلم کے بعض اہل علم نے مجھ سے بیان کیا[3] بعض مقامات پر حدثنی بعض اصحابنا کہا ہے یعنی مجھ سے ہمارے بعض مشائخ نے بیان کیا ہے۔

بعض جگہ فیما بلغنی کہہ کر واقعہ بیان کرتے ہیں، متعدد مقامات پر حدثنی من لا اتهم کہہ کر روایت کرتے ہیں اور بعض مرتبہ حُدِّثْتُ کے لفظ سے واقعہ نقل کرتے ہیں جیسا کہ سیرت ابن ہشام میں ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ محدثین کے مقابلہ میں اہل سیر و مغازی کی سند کا معیار کم درجہ کا ہوتا ہے کیونکہ ان کے یہاں واقعات و اخبار کا بیان ہوتا ہے عقائد اور تشریعی احکام نہیں ہوتے ہیں۔

ایک شبہ کا ازالہ یہاں ایک شبہ کا ازالہ ضروری ہے، امام احمد بن حنبل کا قول ہے ثلاثه كتب ليس لها اصول المغازی، والملاحم والتفسیر　　تین فن کی کتابیں بے بنیاد ہیں، مغازی اور ملاحم اور تفسیر۔

یہ قول مغازی و ملاحم اور تفسیر کی عام کتابوں کے بارے میں نہیں ہے بلکہ ان تینوں علوم کی بعض مخصوص کتابیں مراد ہیں جو اپنے بیان کرنے والوں کی بے اعتباری اور داستان گوئی کی وجہ سے ناقابل اعتماد ہیں جیسا کہ خطیب بغدادی نے تصریح کی ہے[4] چنانچہ خود امام احمد کہتے تھے کہ تم لوگ مغازی موسیٰ بن عقبہ حاصل کرو وہ ثقہ ہیں[5]

اور ابراہیم حربی کا بیان ہے کہ احمد بن حنبل ہر جمعہ کو ابن اسعد کے یہاں سے واقدی کی کتابوں کے دو جزء منگا کر دیکھتے تھے اور دوسرے جمعہ کو ان کو واپس کر کے دوسرے دو جزء منگاتے اور دیکھتے تھے[6] امام احمد کا یہ بھی قول ہے کہ ابن اسحاق سے مغازی حاصل کی جاتے، البتہ حلال و حرام میں احتیاط کی جاتے[7]

---

[1] سیرت ابن ہشام ص۲۵ ج۲ [2] ایضاً ص۹۰ و ص۹۸ ج۲ [3] ایضاً ص۲۱۰ ج۲ [4] تذکرة الموضوعات محمد طاہر گجراتی ص۸۲ [5] تذکرة الحفاظ ص۱۲۰ ج۱ [6] تاریخ بغداد ص۱۱ ج۳ تہذیب التہذیب ص۳۶۶ ج۹۔ [7] الجرح والتعدیل ص۱۹۳ ج۳۔

ڈاکٹر کلیم اللہ سارایو، لیکچرر سندھ یونیورسٹی
جامشورو حیدرآباد

انسانی معاشرہ اور تمدن کے مراحل

امام شاہ ولی اللہؒ کی تعلیمات کی روشنی میں

۱

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ نے جہاں دینی علوم قرآن و حدیث کے لیے قابلِ قدر خدمات سرانجام دیتے ہیں، وہاں آپ نے انسانی زندگی اور تمدن کے مراحل کو بھی اُجاگر کیا ہے۔

درج ذیل مضمون میں ہم نے حضرت شاہ صاحب کی تعلیمات کی روشنی میں انسانی معاشرہ اور تمدن کے مراحل کا تجزیہ پیش کیا ہے جو کہ حضرت شاہ صاحب کی مشہور کتابوں حجۃ اللہ البالغہ اور البدور البازغہ کے اہم ابواب سے اخذ کیا گیا ہے۔

حضرت شاہ صاحب نے انسانی ارتقائی مراحل کو ایک ایک ارتفاق سے موسوم کیا ہے اور ایک ارتفاق کی روشنی میں دوسرے ارتفاق کی طرف ہمیں لے جاتے ہیں اور ارتفاقات کو طبعی الہامات کا ترجمان قرار دیتے ہیں۔ یعنی انسان اپنی جملہ حاجات یا ضروریات کو خواہ وہ شخصی ہوں یا اجتماعی ان سب کو پورا کرنے کیلئے انسان قدرت کے الہامات کی اطاعت کرتا ہے۔ شاہ صاحب کے ان ارتفاقات کو ہم انسان کے ارتقائی مراحل کا نام دیتے ہیں۔ شاہ صاحب کے ارتفاقات پر بہت سارے محققین نے لکھا ہے کیونکہ شاہ صاحب کا کلام نہایت معنی خیز وسیع تر حکمت سے بھرپور ہے۔ جناب پروفیسر جلبانی صاحب نے اپنی کتاب شاہ ولی اللہ کی تعلیم میں شاہ صاحب کے ارتفاقات اور رسومات پر کچھ جائزہ پیش کیا ہے۔

جناب ڈاکٹر عبدالواحد ہالے پوتہ نے بھی اپنے تحقیقی مقالے میں جو انہوں نے آکسفورڈ یونیورسٹی میں شاہ صاحب کے عملی علم کلام پر لکھا ہے اور نہایت تفصیل کے ساتھ ان ارتفاقات کو جدید خطوط پر ڈالا ہے۔
میں نے حجۃ اللہ البالغہ کے باب ارتفاقات کے مدنظر یہ نہایت مختصر تجزیہ کیا ہے یہ ایک اضافی کوشش ہوگی ہم نے اس تجزیہ کو انسانی سماج کے چار ارتقائی ادوار میں تقسیم کیا ہے جس کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔

انسان کے معاشرتی ارتقاء کا پہلا دور انسان ابتدائی مرحلے میں دیگر حیوانوں کے ساتھ طبعی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے برابر کا شریک ہے۔ سب سے پہلے خوراک

مانا، پانی پینا، جنسی خواہشات، بارش اور سورج کی دھوپ سے بچنا، سردی کے اثر سے بچنا، ان چیزوں میں بلکہ حیوان اور انسان سب کے سب شریک ہیں[1]

انسان کو قدرت کی طرف سے طبعی الہامات ہوتے ہیں جس سے وہ حاجتوں کو پورا کرنے کے لیے رہنمائی حاصل کرتا ہے۔ شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے انہیں حاجات اور ضروریات کو پورا کرنے کے لیے طبعی اور فکری الہامات عطا فرماتا ہے۔ انہیں الہامات کی روشنی میں وہ ان حاجات کو پورا کرتا ہے[2]

پہلے دور کی ضروریات زندگی سب سے پہلا دور انسانی معاشرے کا مذکورہ ضروریات اور حاجات کو مدنظر رکھ کر جنم لیتا ہے اور مندرجہ ذیل چیزوں کو اپناتا ہے مثلاً کھیتی باڑی کرنا، پانی کا نظام درست کرکے کھیتوں کی آبیاری کرنا جس کو ہم اخلاقی کردار اور قدریں کہیں گے انہیں کیفیات کی وجہ سے مثلاً بہادری، اپنی عقل اور ذہانت سے فرد کے بجائے جماعت کے لیے سوچنا وغیرہ اور یہ کیفیات اس مرحلے میں اتنی موثر اور لطیف نہیں ہوتیں جیساکہ انسان کے چوتھے ارتقائی مرحلے اور اس طرح وہ کیفیات یا اصول جو اعلیٰ مرحلوں میں زیادہ اہمیت اختیار کرتے ہیں اس مرحلے میں وہ بالکل مختلف اور کم نظر آتے ہیں مثلاً جمالیاتی طبیعت، حسن و قباحت خوشی و مسرت وغیرہ[3]

بہرکیف ہمیں انسان کے اس پہلے معاشرتی مرحلے پر جو انسانی کیفیات اور ضروریات کا پتہ چلا ان کو پورا کرنے کے لیے انسان کو قدرتی الہامات عطا ہوتے ہیں ان الہامات کی روشنی میں ان حاجات کو پورا کرنے کے لیے آسان راستہ تلاش کرتا ہے مثلاً پانی کے لیے رسی اور برتن وغیرہ کا ہونا اور نیند کرنے کے لیے بستر کا ہونا اور اپنے نفس کے خواہشات کو زیر کرنے کے لیے نکاح کرنا اور مل کر رہنے کے لیے گھر بنانا وغیرہ اور اپنی خاندانی پرورش میں نظام زندگی کو جنم دیتا ہے جو ایک مستقل ادارہ یا گروہ بن جاتا ہے اس طرح انسان اپنی مذکورہ بالا ضروریات کو پورا کرنے کے لیے نت نئے ارتفاقات کی تلاش میں رہتا ہے اسی طرح انسان کی معاشرتی زندگی کا دوسرا ارتقائی مرحلہ پیدا ہوتا ہے جس کو ہم انسانی معاشرتی اور سماجی ارتقاء کا دوسرا مرحلہ کہیں گے۔

انسانی معاشرے کا دوسرا ارتقائی دور دوسرے ارتقائی مرحلے میں زندگی کے پانچ شعبے جنم لیتے ہیں انسان کے معاشرتی ارتقاء کا دوسرا مرحلہ پہلے ارتقائی مراحل کے بعد شروع ہوتا ہے یعنی پہلے جستجو اور طبعی الہامات سے جو صلاحیتیں وجود میں آئی ہیں اسی کے ذریعے زندگی کے لیے آسان طریق طریقے اختیار کرنا اور ان کو مروج کرنا انسان کے اس دوسرے ارتقائی مرحلے میں زندگی

[1] حجۃ اللہ البالغہ ص۴۳ مکتبہ سلفیہ لاہور، البدور البازغہ ص۵۳ مطبوعہ مدینہ برقی پریس بجنور (یوپی)
[2] ایضاً ص۱
[3] ایضاً ص۲

ے پانچ شعبے جنم لیتے ہیں۔

انفرادی یا شخصی زندگی

دوسرے معاشرتی ارتقاء میں سب سے پہلے شخصی زندگی کا شعبہ شروع ہوتا ہے۔

معاشرتی ارتقاء کے دوسرے مراحل میں مندرجہ ذیل انسانی زندگی کے شعبے جنم لیتے ہیں سب سے پہلے شخصی زندگی کا شعبہ شروع ہوتا ہے یعنی انسان سب سے پہلے اپنی زندگی کی تسکین کے لیے فرداً مندرجہ ذیل چیزوں کی تلاش کرتا ہے مثلاً کھانا پینا، گھر، آداب زندگی وغیرہ معاشرے کے ہر دور یا ہر قسم میں انسانی فرد سب سے پہلے اپنی انفرادی ضرورت کو پورا کرتا ہے اور انسان کی معاشرتی زندگی کا دوسرے ارتقائی مرحلے میں یہ پہلا ہی شعبہ ہے۔

گھر یا خاندان کا قائم کرنا

دوسرے مرحلے میں نئے رواج اور نئی رسوم وجود میں آتی ہیں۔

انسان اپنے دوسرے ارتقائی مرحلے میں شخصی ضروریات کو پورا کرنے کے بعد وہ گھریلو زندگی کی طرف رُخ کرتا ہے مثلاً شادی کرنا، بچوں کا پیدا ہونا، ان کی ذمہ داریوں کو پورا کرنا، ان کی خدمت حفاظت کو اپنے ذمے بنانا یہ سب انسان کے دوسرے ارتقائی مرحلے میں جنم لیتے ہیں اسی طرح رشتہ داروں، دوستوں، خادموں اور دوسرے افراد کے لیے احساس ذمہ داری پیدا ہوتی ہے اسی ہی طبقے میں یاعدہ درجہ میں نئے رواج اور طور طریقے وجود میں آتے ہیں۔ بعض اوقات مشترکہ خاندان بھی ان سب کا مظہر بنتے ہیں۔

شاہ ولی اللہؒ گھریلو یا خاندانی زندگی کو تدبیر المنزل سے تعبیر کرتے ہیں یعنی گھریلو ذمہ داریوں کے ادا کرنے کی حکمت کا علم[2]

فنی معاملات

انسان دوسرے مرحلہ میں مختلف ضروریات اور پیشوں کو اختیار کرتا ہے۔

انسان کے اس ارتقائی مرحلے میں شخصی اور گھریلو زندگی کے بعد جس چیز کی ضرورت پیش آتی ہے جس کو شاہ صاحب نے فنی معاملات سے تعبیر کیا ہے جسمیں انسان مختلف پیشوں کو اختیار کرتا ہے اور آپس میں حاجات کو پورا کرنے کے لیے چیزوں کا تبادلہ کرتا ہے جس سے آگے چل کے تجارت لین دین اور انسانی پیشوں اور ہنروں کا فروغ ہوتا ہے اور یہ کام یا جستجو کی حیثیت رکھتے ہیں مثلاً محنت مزدوری پیداوار کا ذریعہ تلاش کرنا اور روزگار کو خاص کرنا اور اسکی ترقی کے لیے فکر کرنا۔ شاہ صاحب اسے حکمت اکتسابیہ کہتے ہیں۔

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ص۱۲-۲۰، شاہ ولی اللہ کا فلسفہ ص۱۱۱ البدور البازغہ ص۶۱ مطبوعہ مدینہ برقی پریس بجنور (یوپی)
[2] حجۃ اللہ البالغہ ص۳۳-۴۲ شاہ ولی اللہ کا فلسفہ ص۱۱۱ البدور البازغہ ص۶۲ مطبوعہ مدینہ برقی پریس بجنور (یوپی)

حکمتِ تعاملیہ تجارتی معاہدے اور لین دین کا شعبہ:۔ انسان کے اس دوسرے ارتقائی مرحلے میں یہ شعبہ قائم ہوتا ہے جس کو شاہ ولی اللہؒ نے حکمتِ تعاملیہ کا نام دیا ہے اس حکمت یا شعبے میں مندرجہ ذیل چیزیں فروغ پاتی ہیں[1] شلاً خرید و فروخت قرض اور رہن کرایہ اور دیگر امن شعبے سے تعلق رکھنے والے اشیاء۔ اور پیشے جنم لیتے ہیں[2]

حکمتِ تعاونیہ امداد باہمی کا شعبہ:۔ دوسرے ارتقائی مرحلے میں امداد باہمی کا شعبہ بھی جنم لیتا ہے شاہ ولی اللہ کے نزدیک یہ شعبہ حکمت تعاونیہ کے نام سے منسوب ہوتا ہے یعنی امداد باہمی کا علم اس شعبے میں یقین دہانی کی ضمانت مشترکہ ملکیت کا کاروبار یعنی پیشہ وارانہ زندگی تجارتی معاہدے شامل ہیں آخری تین شعبے یعنی پیشہ وارانہ زندگی تجارتی اور امداد باہمی کے یہ شعبے ایک معاشرے کے معاشی زندگی کے ترقی و فروغ کے لیے مختلف پہلوؤں کی نمائندگی کرتے ہیں اس لیے ان تینوں کو مشترکہ طور پر ایک شعبہ تصور کیا جاسکتا ہے اور دوسرے لفظوں میں اسے معاشی زندگی کی رہنمائی کا شعبہ بھی کہا جاسکتا ہے۔

زندگی کا ہر ایک شعبہ دوسرے شعبوں سے مربوط ہوتا ہے۔

اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کا ایک شعبہ دوسرے شعبوں سے مربوط رہتا ہے یعنی ایک دوسرے سے تعلق رکھتے ہوئے مذکورہ شعبوں کو جنم دیتا ہے اور ان سب کو مجموعی حیثیت سے معاشرے کی اجتماعی شکل میں ایک ستون کی حیثیت حاصل ہے۔

انسان اپنے دوسرے ارتقائی مراحل کے آخر میں مملکت کے قیام کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔

انسانی معاشرہ اپنے ارتقاء کے دوسرے مرحلے سے گزر کر معاشرے کے ایک وسیع تر اتحاد کی شکل میں فروغ پاتا ہے جو مملکت کی تشکیل کرتا ہے اسی طرح دوسرے ارتقائی مراحل کے آخر میں اجتماعی طور پر حکومت کے قیام کی ضرورت محسوس کرتا ہے شاہ ولی اللہؒ اس اجتماعی ضرورت کو حقیقی مملکت یا ایک مستحکم یا تجارتی اور یہ معاشرتی مراکز کا نام نہیں دیتے بلکہ انسانوں کے مختلف گروہوں کے درمیان اتحاد کی ایک شکل ہے جو زندگی کے مختلف شعبوں کے طور پر وجود میں آتی ہیں جس سے مختلف وسائل یا تبادلہ اشیاء۔ اور تعاون کے شعبے پیدا ہوتے ہیں جس سے داخلی اتحاد اور فرد واحد کی سالمیت پیدا ہوتی ہے شاہ ولی اللہ کی نظر میں یہ سب باتیں اور زندگی کے شعبے سب مل کر تیسرے ارتقائی مرحلے کو جنم دیتے ہیں اور اس کی ترقی

---

[1] شاہ ولی اللہؒ کا فلسفہ صد ۱۱۴ [2] ایضاً صد ۱۱۵

کے لیے کوشاں رہتے ہیں جس کو شاہ ولی اللہؒ نے ارتفاق سوئم کہا ہے۔

انسانی معاشرے کا تیسرا ارتقائی دور

تیسرے ارتقائی مرحلے میں معاشرہ ایک متحدہ نظام کی طرح ہو جاتا ہے۔

انسانی معاشرہ کے دوسرے مرحلے کے بعد معاشرتی ارتقاء کا یہ تیسرا مرحلہ سابقہ مرحلے کے نتیجے میں ایک فطری نتیجہ ہے جس میں معاشرہ حقیقی طور پر ایک متحدہ نظام کی طرح ہو جاتا ہے اور یہی مملکت یا حکومت کی بنیاد ہے اتحاد اور اجتماعیت مزید معاشی ارتقاء کی ضرورت محسوس کرتے ہیں جو کہ ایک ہم رنگ مملکتی حکومت کی تخلیق و ترقی کی طرف واقع ہوتا ہے۔

اسی ارتقائی مرحلے میں انسان اپنے لیے اجتماعی سوسائٹی یا معاشرہ کی ضرورت محسوس کرتا ہے اور شاہ ولی اللہ نے اس اجتماعی ضرورت یا صورت کو اور اس ضرورت یا صورت کو مکمل طرح ایک منصوبے کے تحت کام کرنا اور اسے مضبوط کرنا ان سب باتوں کو شاہ ولی اللہ نے انسانی ارتقائی مرحلے کو ارتفاقات سوم سے منسوب کیا ہے اس سے قبل ہے کہ مملکت کی تکمیل اور ضروریات اور اس کے طریق کاروں کا جائزہ لیا جائے تو اس سلسلے میں شاہ ولی اللہ کے وہ تصورات حکومت اور اس کے باہمی ربط کے بارے میں ہم شاہ صاحب کی کتاب "البدور البازغہ" کی ایک عبارت ہم نقل کر رہے ہیں جو شاہ صاحب نے اس موضوع کے متعلق لکھی ہے اور یہی عبارت پروفیسر ڈاکٹر عبدالواحد ہالے پوتا صاحب نے اپنے تحقیقی مقالے شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ میں خود نقل کی ہے جس کے اقتباسات مندرجہ ذیل ہیں اور شاہ صاحب کا یہ نظریہ یا تصور انسان کے تیسرے ارتقائی مرحلے کے متعلق ہے۔[1]

مختلف لوگ مختلف پیشوں کے ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے کی ضروریات کو جنم دیتے ہیں اور پورا بھی کرتے ہیں۔

بلاشبہ جب انسان ایک دوسرے سے باہمی لین دین کرے اور مختلف لوگ مختلف پیشوں میں ماہر ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کی ضروریات پیدا کرتے ہیں۔ اور فراہم بھی کرتے ہیں اور نتیجہ کے طور پر تجارت اور تبادلہ کی مختلف شکلیں وجود میں آتی ہیں۔

شاہ صاحب کی نظر میں صرف چاردیواری اور تجارتی مرکز کا نام حکومت نہیں ہے،

مثلاً تعاونی چیزوں کی لین دین وغیرہ یہ لازمی طور پر اس اہمیت کو واضح کرتی ہے کہ لوگوں کے

[1] شاہ ولی اللہ کا فلسفہ ص۱۶۱ از ڈاکٹر ہالی پوتا۔ شاہ ولی اللہ اکیڈمی حیدر آباد سندھ

درمیان مثلاً کاشت کار، تاجر، جولاہوں وغیرہ کے درمیان ایک قسم کا رشتہ یعنی اتحاد موجود ہے یعنی یہ لوگوں کے وہ گروہ ہیں جن کے جوڑنے سے حقیقت میں مملکت کا نظام ترتیب پاتا ہے حقیقی مملکت صرف چار دیواری قلعہ اور تجارتی مراکز کا نام نہیں ہے اگر ایک دوسرے کے قرب وجوار میں بہت سے شہر واقع ہوں اور ان میں رہنے والے لوگ باہمی لین دین کرتے ہیں تب یہ ایک مملکت کہلائے گی۔

شاہ صاحب کی نظر میں حکومت کے اندر فرد اور جماعت کو ایک جیسی حیثیت حاصل ہے۔

اس نقطۂ نگاہ سے ایک مملکت کو اتحاد کے رشتے سے تصور کیا جائے وہ فرد واحد یا ایک نظام الاعضاء کی طرح ہو جاتی ہے جسمیں لوگوں کے گروہ اور ہر فرد کی حیثیت وہی ہوتی ہے جو اس شخص کے جسم میں ایک دھڑ یا ٹے سے عضو کی ہوتی ہے ایک مملکت میں اتحاد لازمی شے ہے سب سے پہلے اس اتحاد کے تحفظ کی ضرورت ہے تب اس کے تمام فائدے اٹھانے کے لیے اسے ترقی اور فروغ دینے کی ضرورت ہے حکومت نظام (تدبیر) جس کے ذریعے ایک مقصد حاصل ہوتا ہے وہی حقیقی رہنما (امام) یا مملکت کا فرماں روا ہے شاہ ولی اللہ کے نزدیک حکومت کا فرماں روا نہ صرف کلیتہً ایک انسانی فرد کا خاکہ ہوتا ہے ماسوائے شبہ جب ایک مستحکم طاقت اور شخصیت کا حامل شخص جو قطعی طور پر اس کام کے لیے موزوں ہو اور مملکت کے امور سنبھالے وہ مملکت کا سربراہ ہوتا ہے حالانکہ وہ دونوں خارجی اور ظاہری طور پر سربراہ ہوتا ہے۔

شاہ صاحب کے اس اقتباس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان فردی یا شخصی طور پر حاکم نہیں ہوتا بلکہ جب وہ انسانی معاشرہ یا سوسائٹی میں ایک مستحکم اور بہت باصلاحیت شخص ہو جو انسان کے اجتماعی نظام کو سمجھتا ہو اور اس کو مضبوط، محکم کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو وہی اس کے لیے موزوں ہے۔

انسان کے اس تیسرے ارتقائی مرحلے میں جب اجتماعی نظام میں حکومت کی ضرورت پڑتی ہے اور اسے مضبوط اور مستحکم طور پر چلانے کی ضرورت پڑتی ہے چونکہ اجتماعی زندگی میں انسانی افراد میں عدل اور ظلم کا امکان رہتا ہے یعنی عدل اور اچھے نظام سے اجتماعی زندگی مضبوط اور بہتر ہوتی ہے ظلم سے اجتماعی زندگی کمال کے بجائے زوال اختیار کرتی ہے اس لیے اس اجتماعی زندگی کو جس میں حکومت کا تصور موجود ہے۔ شاہ صاحب کی نظر میں اسے بہتر بنانے کے لیے مندرجہ ذیل چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے جو انسان کے تیسرے ارتقائی مراحل کی ضرورت ہیں جن کو ہم مملکت کی ضروریات کہیں گے۔　　(باقی آئندہ)

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ
حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ
اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝ وَاعْتَصِمُوْا
بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا

O ye who believe! Fear God as He should be feared, and die not except in a state of Islam. And hold fast, all together, by the Rope which God stretches out for you, and be not divided among yourselves.

جناب سید احتشام احمد ندوی ایم اے، بی ٹی، ایچ

امیر شکیب ارسلانؒ

انیسویں صدی عیسوی کے ربعِ آخر اور بیسویں صدی کے نصفِ اول میں عالمِ اسلامی کی ایک عظیم شخصیت سے روشناس ہوا جس کی زندگی میں سیف و قلم دونوں طرز کے کمالات کی یکساں کارفرمائی تھی۔ یہ شخصیت امیر شکیب ارسلان کی تھی جو بیک وقت زبردست مورّخ، ادیب اور شاعر تھے اور ساتھ ہی ساتھ ایک دردمند مصلح اور ایک سرگرم مجاہد بھی۔ ان کی زندگی ایک ایسے دور میں بسر ہوئی جو عربوں اور ترکوں کی تاریخ کا ایک بہت نازک دور تھا۔ امیر اس ساری کش مکش میں خود شریک رہے اور بعد میں اس کی داستاں سرائی میں قلم کے جوہر دکھاتے رہے امیر کی زندگی میں ایک عجیب کشش محسوس ہوتی ہے جو ان کے قلم اور ذوقِ عمل دونوں ہی سے عبارت ہے۔ ان کی شخصیت میں علم و عمل کی ایک ایسی بلندی نظر آتی ہے جس سے انسان متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا[1]

اس عظیم شخصیت کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ میں ایک نقشہ ان حالات اور واقعات کا پیش کروں جن میں امیر کی شخصیت نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کے دور میں جو سیاسی تبدیلیاں عالمِ اسلام میں رونما ہوئیں انہوں نے امیر کو ذہنی حیثیت سے بہت متاثر کیا جس کا اظہار یوں تو ان کی تمام تصانیف میں ہوتا ہے مگر "حاضر العالم الاسلامی" کے حواشی میں ان کا یہ تاثر بہت نمایاں ہو جاتا ہے۔ ان کی یہ کتاب ایک عظیم کارنامہ ہے جس میں ایک جانب ایک بڑا قیمتی تاریخی مواد موجود ہے اور خود اس کے قلم سے جس نے ان واقعات کا مشاہدہ کیا ہے۔ اور دوسری جانب ان کے دینی خیالات اور آراء کا مرقع بھی ہے۔

امیر شکیب ۱۸۶۹ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۴۶ء میں وفات پائی۔ اس ایک صدی میں انہوں نے عربوں، ترکوں اور اہلِ یورپ کا بڑے قریب سے مطالعہ کیا۔ عثمانی خلافت سے قرب کی بنا پر وہ مغربی ممالک کی چالاکیوں سے خوب واقف ہو گئے تھے۔ اور زندگی کا بڑا حصہ یورپ میں گذارنے کی وجہ سے انہیں مغرب کے طرزِ فکر سے پوری آگاہی حاصل تھی۔ سوئزرلینڈ میں ربع صدی گذارنے کی وجہ سے وہ مغربی سیاست کو بے نقاب دیکھ چکے

---

[1] مصادر الدراسۃ الادبیۃ جلد ۲

یہی وجہ ہے کہ امیر کے خیالات اور ان کی زندگی کو اس وقت تک سمجھنا بہت مشکل ہے جب تک کہ اس ماحول اور ان واقعات کو نہ سمجھا جائے جو اس وقت ترکی، شام اور دوسرے عرب و اسلامی ممالک میں رونما ہوئے تھے۔[1]

امیر کے ذہنی ماحول کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے میں ان کے ذاتی حالات کا جائزہ لوں۔

امیر کا تعلق ابو قابوس کے خاندان سے تھا جو مشہور عربی شاعر نابغہ ذبیانی کا ممدوح تھا۔ خلیفہ ابو جعفر منصور کے زمانہ میں ان کے آباؤ اجداد لبنان آئے یہاں بیروت میں ایک شخص ارسلان نے جو اسی خاندان سے تھا وفات پائی اور اس کے بعد یہ لوگ لبنان میں ایک مقام "شویفات" میں منتقل ہو گئے۔ ارسلان کا لڑکا مسعود تھا جس کے چار بیٹے ہوئے اور ان میں سے تین کو خدا نے شاعرانہ صلاحیت سے نوازا یعنی حسن، عادل اور امیر ان سب کا کلام شائع ہو چکا ہے۔ امیر شکیب کے "ارسلان" لکھنے کی وجہ یہی ہے۔

امیر شکیب ۱۸۶۹ء میں لبنان میں پیدا ہوئے۔ پہلے گھر میں تعلیم پائی پھر مدرسۃ الحکمۃ میں داخل ہوئے وہاں جا کر ان کے علمی جوہر نمایاں ہونے لگے اور نظم و نثر دونوں میں ان کی استعداد کا علم لوگوں کو ہوا۔ مدرسۃ الحکمۃ میں ایک بار امام محمد عبدہ آئے۔ اس نوجوان طالب علم نے ان سے ملاقات کی۔ انہوں نے فرمایا کہ میں تمہارے نام سے تو واقف ہوں امید ہے کہ تم آگے چل کر بڑے شاعر بنو گے۔

اس کے بعد امیر "المدرسۃ السلطانیہ" میں داخل ہوئے اور ترکی پڑھی پھر ۱۸۹۰ء میں مصر جا کر چند ماہ محمد عبدہ کے پاس گذارے۔ وہاں سے آستانہ جا کر جمال الدین افغانی سے تعلقات پیدا کئے۔ وہاں سے ۱۸۹۲ء میں پیرس گئے اس وقت ان کے ذہن و دماغ پر جمال الدین افغانی اور محمد عبدہ کے علمی و اسلامی خیالات چھائے ہوئے تھے کچھ دنوں بعد جب امیر بیروت واپس آئے تو ان سے اور سید رشید رضا سے بہت گہرے مراسم پیدا ہو گئے۔ اسی درمیان انہیں "شوف" کی قضاۃ کا عہدہ مل گیا۔ ۱۹۰۸ء میں۔ بعد میں مقامی عثمانی حکام سے اختلافات ہو گئے جس کی بنا پر امیر نے اس عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔ اور "مجلس المبعوثین" آستانہ کے رکن ہو کر پہلی جنگ عظیم تک کام کرتے رہے۔[2]

ذہنی صلاحیت و ثقافت کے اعتبار سے وہ غیر معمولی اہمیت کے مالک تھے۔ ترکی بیروت ہی میں سیکھی تھی پھر آستانہ میں ترکوں کے ساتھ رہ کر اس کو گویا مادری زبان سی بنا لی تھی۔ فرانسیسی بھی بیروت ہی میں سیکھی اور مختلف فرانسیسی پرچوں میں مضامین لکھتے رہے اور ۲۵ سال تک سوئٹزرلینڈ کے زمانہ قیام میں فرانسیسی ہی روزمرہ استعمال کرتے رہے۔ جرمن زبان برلن میں سیکھی اور وہاں شوقی کے بعض قصائد کا ترجمہ بھی جرمن زبان میں کیا تھا

---

[1] محاضرات عن الامیر شکیب ارسلان [2] مجلہ کتاب فروری ۱۹۴۵ء رفائیل بطی ص ۲، ۵۔ محاضرات ۱۸۶

یسی زبان میں ایک رسالہ نکالا۔ جو یادداشت فرانسیسی زبان میں امیر نے یادگار چھوڑی ہے وہ بیس ہزار صفحات پر
ہوئی ہے۔ تقریباً ۲۰ ہزار خطوط یادگار چھوڑے ہیں۔ وہ ۲۰۰۰ مقالے، دو ہزار خطوط اور کچھ ہزار صفحے اپنی
نیف کے ہر سال لکھتے تھے۔ اور اپنے دور کے سب سے بڑے مقالہ نگار تھے۔ مختلف زبانوں کی واقفیت
وجہ سے ان تصانیف میں روشن خیالی نمایاں ہے۔

اس وسیع ذہنی تہذیب و ثقافت نے ان کے خیال کے افق کو بہت وسیع کر دیا تھا۔ ان جدید زبانوں کے
در لٹریچر نے ان کو بہت متاثر کیا تھا اور اسلامی علوم و فنون کے ساتھ ساتھ انہیں روشن خیال بنا دیا تھا۔

اب ذرا اس دور کے سیاسی حالات پر ایک نظر ڈالئے اور ان میں امیر کی جدوجہد کا اندازہ کیجئے تاکہ ان
شخصیت کا ایک نقشہ نگاہوں میں آجائے۔

سولھویں صدی میں شام پر دولت عثمانیہ کا قبضہ ہو گیا۔ چونکہ اسلامی خلافت میں عیسائیوں سے جزیہ لیا جاتا
ا اور ملازمتیں عملاً مسلمانوں ہی کے ہاتھوں میں تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ مغربی حکومتیں بار بار عیسائیوں کی حفاظت کا
ی کرتی تھیں اور اس بہانے دولت عثمانیہ کے اندرونی معاملات میں دخل انداز ہوتی تھیں

عربی سلطنت میں جو دولت عثمانیہ کے قبضہ میں تھی اس کے نظریاتی طور پر دو حصے ہو گئے تھے۔ ایک طبقہ
ہت عثمانیہ کا حامی تھا اور اس کو اسلامی خلافت تصور کرتا تھا۔ دوسرا گروہ عربوں اور عیسائیوں سے مرکب تھا
عثمانی حکومت کو ایک استبدادی حکومت خیال کرتا تھا۔ اور اس سے آزادی حاصل کرنے کی جدوجہد کر رہا تھا۔
ہ اس کے لئے بھی تیار تھا کہ اگر موقع ملے تو دولت عثمانیہ کے دشمنوں اور مغربی حکومتوں سے مدد لے۔

محمد علی نے مصر و شام پر قبضہ کر لینا چاہا مگر فرانس و انگلستان اس بات سے ڈرنے لگے کہ مبادا کہیں یہ ایک
مضبوط حکومت نہ قائم کر دے۔ لہٰذا درمیان میں پڑ کر صرف مصر کو محمد علی کے پاس رہنے دیا۔ دروز اور عیسائیوں کے
ختلافات نے فرانسیسیوں کو اپنا اثر بڑھانے کا موقع دیا۔ علاوہ ازیں دول عظمیٰ سلطنت عثمانیہ کی تقسیم کا نقشہ تیار کر چکی
تھیں۔ چنانچہ طرابلس پر اٹلی، مصر پر انگریز اور تیونس پر فرانس قابض ہو گئے۔

یہ لوگ انسانیت اور آزادی کے نام پر عربوں کو غلام بنا رہے تھے۔ اور عرب قومیت کے جذبات عثمانیوں
کے خلاف برانگیختہ کر کے خود فائدہ اٹھا رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت حال میں عثمانیوں کو عربوں کی جانب سے
خطرہ بڑھ گیا۔ اور حکومت نے بے شمار جاسوس عرب ملکوں اور خود ترکی میں پھیلا دیئے۔ حکومت کا یہ حال ہو گیا
کہ ملازمین کی تنخواہیں تک مہینوں ادا نہ ہو پاتیں[۵] تھیں۔

---

[۵] دولت عثمانیہ ج ۲۔ باب نوجوان ترک

علاوہ ازیں عربی زبان ترکی میں پڑھائی جاتی تھی خود عربوں کے اپنے مدارس مفقود تھے عربی عموماً عیسائیوں کی تعلیم گاہوں میں اچھی پڑھائی جاتی تھی۔ یہ عثمانی حکومت کی ایک ایسی غلطی تھی کہ جس سے مغربی حکومتوں نے بڑا فائدہ اٹھایا۔ امریکہ نے بیروت میں ایک عظیم عربی درسگاہ کھولی۔ اس کی اتباع میں فرانسیسیوں، انگریزوں، روسیوں اور جرمنوں نے بھی اپنی طرز کے مدرسے کھولے۔

امیر شکیب فرماتے ہیں کہ جدید دور میں علم کی روشنی بیروت ہی سے عربی دنیا میں پھیلی ہے۔ شام میں دمشق بھی علمی حیثیت سے پیچھے نہیں رہا۔ یہاں اکثر علمی و تنقیدی محفلیں منعقد ہوتی تھیں۔ جن میں امیر حصہ لیا کرتے تھے جو لوگ بیروت کی درسگاہوں سے فارغ ہوتے ان کی شہرت مصر جاکر ہوتی۔ کیونکہ مصر اپنی قدیم اور عظیم علمی شہرت کی وجہ سے زیادہ اہمیت رکھتا تھا۔ اور وہاں صحافت کا بازار بھی زیادہ گرم تھا۔ عموماً اہل علم قاہرہ استفادہ کرنے جایا کرتے تھے۔ امیر شکیب، کرد علی اور عبدالقادر المغربی وغیرہ قاہرہ گئے۔ اور وہاں سے ان کی شہرت بڑھی یہ تھے سیاسی اور تعلیمی حالات جن میں امیر شکیب پروان چڑھے۔

انیسویں صدی کا ربع آخر اور بیسویں صدی کا ربع اول عثمانی حکومت اور دولِ عظمیٰ کی باہمی کش مکش میں گذرا امیر شکیب دولت عثمانیہ کو خلافت سمجھتے تھے۔ اور اس کے حامیوں میں تھے۔ وہ اپنے دوسرے ساتھیوں شوقی اسماعیل صبری اور حافظ ابراہیم کی طرح اسلامی خیالات پر مضبوطی سے جمے رہے۔ اور حکومت عثمانیہ کی تائید کرتے رہے اگرچہ لوگ ان کے اس رویہ پر تنقید کرتے تھے لیکن انہیں اپنی رائے پر یقین تھا جب پہلی جنگ ختم ہوئی تو شام و لبنان فرانس کو ملے۔ عراق، مصر اور فلسطین انگریزوں کو۔ اس جارحانہ قبضہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب اسی طرح وہی عربی قومیت مغربی حکومتوں کے خلاف ابھر آئی جس کو برانگیختہ کر کے ان ممالک نے عربوں کو ترکوں کے خلاف کر دیا تھا۔ دوسری جنگ عظیم نے عربوں کے مطالبۂ آزادی میں جان پیدا کر دی اور امیر شکیب نے اپنا وطن لبنان اور اس کے علاوہ شام کو اپنی آنکھوں سے آزاد دیکھ لیا۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں جو سیاسی جدوجہد کی گئی اس میں امیر کی مساعی کو واضح طور پر بیان کیا جائے۔ ۱۹۱۱ء میں جب طرابلس پر اٹلی نے حملہ کیا تو مجاہدین کی صف میں امیر شکیب بھی تھے اور انور و سنوسی بزرگوں کے ساتھ مل کر عزم و ہمت کے جوہر دکھا رہے تھے ۱۹۱۲ء میں وہ ہلالِ احمر عثمانی میں ملازم ہو گئے۔

پہلی جنگ کے بعد امیر کی پوزیشن بڑی نازک ہو گئی۔ عربوں اور ترکوں میں آزادی کی کش مکش تھی۔ عرب سمجھ رہے تھے کہ جس طرح ان مغربی حکومتوں نے مل کر مشرقی یورپ کو آزاد کرایا ہے اسی طرح یہ ہمیں بھی آزادی دلائیں گی۔ مگر یہ محض عربوں کی خام خیالی تھی جس کو امیر خوب سمجھ رہے تھے وہ جانتے تھے کہ اب عرب عثمانیوں کی بجائے مغربی ممالک کے غلام بنیں گے۔ اسی وجہ سے امیر نے عربوں کو ترکوں کی مخالفت سے باز

انور پاشا روسی ترکستان میں سرخ فوجوں سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے تو وہ مقام "مرلیس" ترکی آ گئے۔ اور
ا سے برلن چلے گئے اور آرام سے زندگی گذارنے لگے۔ اسی موقعہ پر انہیں مشہور شاعر گوئٹے کی قبر پر جانے کا اتفاق
ا۔ امیر نے "من شاعر الشرق الی شاعر الغرب" مشرق کے شاعر کی جانب سے مغرب کے شاعر کی طرف ایک نظم
ہی جن میں چند شعر تھے[1]

عربوں نے جب فلسطین اور شام کی آزادی کے لئے قاہرہ میں جلسہ کیا اور جنیوا ایک وفد بھیجنا طے کیا تو
ان کی نظر امیر شکیب پر پڑی۔ اور انہیں برلن سے بلا کر وفد میں شامل کیا۔ امیر برابر شام کی آزادی کے لئے جدوجہد
کرتے رہے۔ وہ جنیوا میں ٹھہر گئے۔ اور ۲۵ سال تک وہیں مقیم رہے۔ مذکورہ وفد کے زمانہ میں امیر نے اٹلی جا کر
مسولینی سے ملاقات کی۔ اور اس کے اثرات سے فرانسیسیوں کو دبانے کی کوشش کی۔ علاوہ ازیں فرانسیسی اخبارات
میں بہت سے مضامین لکھے جس کی وجہ سے عربوں کو امیر کی ذات پر بڑا اعتماد پیدا ہو گیا۔

مہاجرین عرب جو شمالی امریکہ میں مقیم تھے انہوں نے امیر کو بڑی عقیدت سے بلایا۔ امیر نے دعوت نامہ قبول کر لیا
اور ۱۹۲۷ء میں وہ شمالی افریقہ تشریف لے گئے اور وہاں اس مشہور امریکی مصنف اور مستشرق[2] سے ملاقات کی جس نے
"حاضر العالم الاسلامی" مشہور کتاب لکھی تھی جس کا عربی میں ترجمہ کیا گیا تھا۔ اور اس ترجمہ پر امیر نے حواشی لگائے
جس کی وجہ سے کتاب مکمل ہو گئی۔ امریکہ کی یاد میں امیر نے ایک سفر نامہ بھی تیار کیا جو ان کتابوں میں سے ہے۔ جن کو
امیر نے "مکتب المؤتمر الاسلامی" کے حوالہ کر دیا تھا۔ تاکہ وہ ان کے مرنے کے بعد شائع ہو[3]

جب ۱۹۳۴ء میں ابن سعود اور امام یحییٰ شاہ یمن کے درمیان جنگ ہوئی اور صورت حال بڑی خطرناک ہو
گئی تو مؤتمر العالم الاسلامی بیت المقدس نے امیر کی صدارت میں ایک وفد بھیجا۔ جس نے دونوں میں صلح کرائی[4]

۱۹۳۰ء میں وہ فرانس ہوتے ہوئے اندلس گئے وہاں ان علاقوں کو بڑے شوق و تمنا سے دیکھا جہاں سے عربوں
نے فکر و نظر کی دنیا میں روحانی نقوش چھوڑے تھے۔ جو متاثر کرنے والی چیزیں ان کو نظر آئیں نوٹ کر لیں۔

۱۹۳۸ء میں امیر کو شام واپس جانے کی اجازت مل گئی۔ وہ جنیوا سے شام آئے سارے ملک کا دورہ کیا ان
کے عظیم کارناموں کی وجہ سے عربی زبان کی سب سے اہم اور مشہور مجلس "المجمع العلمی العربی" نے ان کو اپنا صدر
منتخب کر لیا یہ ایک بہت بڑا اعزاز تھا۔ جو انہیں دیا گیا لیکن جب امیر کو فرانسیسیوں کی مکاری اور ان کے خلاف
سازش کا علم ہوا تو وہ مایوس ہو کر پھر سوئزرلینڈ چلے گئے۔ ۱۹۴۱ء میں انہیں مصر دیکھنے کی اجازت مل گئی تو وہ

---

[1] مجلۃ الکتاب فروری ۱۹۴۷ء ص ۵۶۸ تا ۵۷۲ [2] اس مستشرق کا نام لوتھروپ ستوڈرد تھا

[3] مجلۃ الکتاب ص ۵۷۰ [4] حوالہ بالا۔

رکھنے کی کوشش کی اور دونوں میں اسلامی اخوت بیدار کرنے کی سعیٔ لاحاصل کرتے رہے۔ امیر کے اس صحیح طرز فکر پر عرب کی جذباتی قوم ان کے خلاف ہو گئی اور ان پر ہر طرف سے لعن طعن ہونے لگی۔ اور انہیں عثمانیوں کا خوشامدی سمجھا جانے لگا۔

امیر اپنے ایک قصیدہ میں اپنے مؤقف کی تائید کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ عربوں کو محض میری جانب سے غلط فہمی ہے۔ میں انہیں جو راہ دکھانا چاہتا ہوں وہ اس وقت ان کے لئے سب سے بہتر ہے۔ وہ فرماتے ہیں ؎

سیعلم قومی أنني لا أغشهم ومهما استطال الليل فالصبح واصله

ترجمہ:۔ عنقریب میری قوم جان لے گی کہ میں اس کو دھوکا نہیں دے رہا ہوں اور رات خواہ کتنی ہی طویل ہو جائے صبح بہر حال ہونے والی ہے[1]

امیر کو سنوسی تحریک سے بڑی دلچسپی تھی اور عقیدت تھی وہ جو دینی فکر اور مسلمانوں کے مستقبل کا نقشہ ذہن میں رکھتے تھے سنوسی تحریک کو اس مقصد سے وہ ہم آہنگ پاتے تھے وہ خود بھی کئی بار اس تحریک میں شریک ہوئے جو دراصل وطنی تحریک نہ تھی بلکہ ایک اسلامی تحریک تھی۔ اور انہوں نے اس تحریک کے ساتھ جہاد میں حصہ لیا۔

سید احمد سنوسی کے حالات بھی انھوں نے اپنی کتاب " حاضر العالم الاسلامی " میں بیان کئے ہیں اور اس تحریک کے بارے میں بہت مفید معلومات فراہم کی ہیں۔ اٹلی نے جب ۱۹۱۰ء میں طرابلس پر حملہ کیا، تو حکومت عثمانیہ کی جانب سے انور پاشا مدافعت کے لئے طرابلس گئے۔ وہاں سنوسی تحریک کے بزرگوں سے ان کے بڑے مراسم ہو گئے۔ امیر بھی اس وقت وہاں مصروف جہاد تھے۔ میدان جہاد میں امیر اور انور ایک ہی خیمہ میں رہتے تھے۔ اور اس طرح دونوں میں بڑے خوشگوار تعلقات ہو گئے۔ انور پاشا نے امیر ہی کے مشورہ سے مدافعت کا نقشہ تیار کیا۔

واقعہ یہ ہے کہ دونوں کے اسلامی خیالات اور خلافت کے قیام کے منصوبے بالکل یکساں تھے۔ اور سنوسی تحریک کے مقاصد بھی یہی تھے۔ اس لئے ان سب میں ایک گہرا رشتہ ہو جانا کوئی بعید از قیاس بات نہ تھی۔ امیر نے حاضر العالم الاسلامی میں انور کے حالات لکھ کر ان کے تعلقات کا حق ادا کر دیا۔[2]

جمال پاشا جب عربوں کی شورش ختم کرنے لبنان و سوریا آئے تو انور پاشا نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ امیر پر اعتبار کریں اور ان کے مشوروں سے کام انجام دیں۔ اگرچہ جمال نے کبھی کبھی امیر کے اخلاص پر شبہ کیا۔ مگر امیر برابر ان کی مدد میں لگے رہے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد امیر کی ساری امیدیں انور سے وابستہ ہو گئی تھیں۔ لیکن جب ۱۹۲۰ء

---

[1] مجلہ "الکتاب" فروری ۱۹۴۷ء استاذ رفائل بطی ص ۵۶۹

[2] ملاحظہ ہوں حاضر العالم الاسلامی کے حواشی خصوصاً انور پاشا در رفقاء

تقریباً ۵۰ برس بعد مصر کی سر زمین میں داخل ہوئے۔ اور اسکندریہ و قاہرہ وغیرہ میں چھ ماہ گذار کر پھر جنیوا چلے گئے۔

ان تمام کوششوں اور کاموں کے ساتھ ساتھ امیر نے اپنے علمی کام جاری رکھے۔ اور ہزاروں صفحات لکھ ڈالے وہ اپنا ایک منٹ بھی ضائع نہ کرتے تھے[1] انہوں نے اتنے مقالات لکھے ہیں کہ انہیں اپنے دور کا سب سے بڑا مقالہ نگار سمجھا جانے لگا[2] چونکہ امیر کے تعلقات اپنے دور کے تمام اہم لوگوں سے تھے اور ان سے وہ قریبی تعلق رکھتے تھے[3] اس لئے امیر کو بہت خط لکھنے پڑتے تھے۔ ان کا قاعدہ تھا کہ وہ خط کا جواب ضرور دیتے تھے۔ ہر سال تقریباً سینکڑوں خطوط لکھتے تھے۔ تیس ہزار خطوط انہوں نے یادگار چھوڑے ہیں۔

امیر کی مالی زندگی کچھ خوشگوار نہ تھی وہ بڑی عسرت سے زندگی گذارتے تھے[4] اس تمام عرصہ میں امیر نے اپنی جائیداد کا بڑا حصہ فروخت کر ڈالا۔ یہی جائیداد دراصل امیر کا ذریعہ معاش تھی جو انہیں لبنان اور سوریا میں ورثہ میں ملی تھی۔ امیر اگرچہ بظاہر بڑی خوشحالی سے رہتے تھے مگر واقعہ یہ ہے کہ عملاً ان کے پاس کچھ نہ تھا اور جائیداد بیچ بیچ کر کام چلاتے تھے۔ اکثر اتنے پیسے تک ان کے پاس نہ ہوتے تھے کہ ہوٹل والوں کو ادا کر سکیں۔

تعجب ہوتا ہے کہ اس صورتِ حال میں فرانس نے کیوں کر ان پر الزامات لگائے۔ کہ امیر کو غیر ممالک سے رقمیں ملتی ہیں۔ اس کا اشارہ جرمنی کی طرف تھا۔ اور اس نے یہ بھی الزام لگایا کہ ہٹلر نے انہیں "ابن برلن" کا خطاب دیا تھا اس سے فرانس کا اس کے سوا اور کوئی مقصد نہ تھا کہ اس طرح امیر کو عرب ممالک کی نگاہوں میں گرا دیا جائے۔

جب ۱۹۴۵ء میں دوسری جنگِ عظیم ختم ہوئی تو فرانس کے اثرات لبنان و شام سے جاتے رہے۔ امیر اپنے وطن واپس آنا چاہتے تھے مگر قرض کے بار کی وجہ سے فوراً واپس نہ آ سکے۔ ۱۹۴۶ء میں وہ اسکندریہ کے راستہ سے "مرفاء" پہنچے۔ بیروت میں ان کا زبردست استقبال کیا گیا۔ اس لئے کہ انہوں نے لبنان کی آزادی کے لئے بہت کچھ کیا تھا۔ جب وہ وطن پہنچے تو زائرین کا سمندر امڈ آیا۔ ڈاکٹروں نے ملنے جلنے سے صحت کی خرابی کی وجہ سے منع کیا مگر امیر برابر ملتے رہے۔ اور گفتگو کرتے رہے۔ انہوں نے یہاں آکر ۳۶ دن اپنے اہل و عیال کے ساتھ گذارے تھے کہ ان پر فالج کا حملہ ہوا۔ چار دن گذار کر یہ آفتاب خاک میں پوشیدہ ہو گیا۔ ان کے جنازہ کے ساتھ چلنے والے بے شمار انسانوں کے علاوہ خود صدرِ جمہوریت شیخ بشارہ خوری بھی تھے۔ اس طرح ان کی تین بڑی آرزوئیں پوری ہوئیں ۱۔ وطن میں انتقال کیا۔ ۲۔ ماں کو دیکھا اور ملک آزاد پایا۔

ان کی نعش ان کے اصل وطن "اشویفات" میں دفن کی گئی اور امیر نے اس خاک میں سونا پسند کیا جس میں

---

[1] محاضرات ص ۲۲ [2] مصادر الدراسۃ الادبیۃ ص ۹۷ [3] مجلۃ الابحاث سنہ ۷ جز ۱ ۱۹۵۴ء و مقالہ نگار جبرئیل جبور ص ۴۳ [4] مصادر الدراسۃ العربیہ جلد ۲ ص ۹۷ [5] مجلۃ المکتاب ص ۵۷۲

انہوں نے بچپن گذارا تھا اور جہاں انہیں جوانی کی دولت عطا ہوئی تھی۔[1]

یہ تو تھی ان کی ظاہری زندگی جو ختم ہو گئی اب آئیے ان کی معنوی زندگی پر ایک نظر ڈالیں جو کہ ختم ہونے والی نہیں ہے یعنی ان کے خیالات اور تصانیف۔

ان کے دینی خیالات بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ مشرق و مغرب کے علوم سے واقفیت کی وجہ سے ان کی زندگی میں بڑا اعتدال و توازن نظر آتا ہے۔ وہ اس صف کے ممتاز لوگوں میں ہیں جس نے سب سے پہلے اسلامی علوم کی واقفیت کے ساتھ ساتھ مغربی علوم وزبان سے بھی گہری واقفیت حاصل کی۔ تعجب ہوتا ہے کہ اس مجاہدانہ زندگی اور حرب و ضرب میں ان کو اتنا موقع کیسے ملتا تھا کہ وہ اتنی زیادہ تصانیف کر سکے۔ مسلمانوں کا اتحاد اور ان کی ترقی امیر کے خیالات کا محور تھی اس سلسلہ میں انہوں نے تین بڑی اہم کتابیں تصنیف کی ہیں۔ یعنی

۱۔ حاضر العالم الاسلامی، جس کا اصل مصنف ستودار د امریکی ہے۔ اس کتاب کا ترجمہ عربی میں "عجاج نویعض" نے کیا ہے۔ امیر نے اس کتاب پر حاشئیے تحریر کئے ہیں۔ لیکن اصل کتاب بالکل دب کر رہ گئی ہے اور پوری کتاب حاشیوں سے پر ہے۔ یہ حواشی امیر کی قلمی جدوجہد کا شہکار ہیں۔

۲۔ لماذا تاخر المسلمون و لماذا تقدم غیرہم۔ امیر سے لوگوں نے درخواست کی تھی کہ آپ مسلمانوں کی پستی کے اسباب پر روشنی ڈالئے، یہ کتاب اس سوال کا جواب ہے جس میں مسلمانوں کے اخلاقی امراض کی نشاندہی کی ہے

۳۔ الحلل السندسیۃ۔ اس کتاب میں مسلمانوں کے حالات کا ذکر کیا ہے ماضی کی یاد دلائی ہے اور مسلمانوں کو چونکانے وغیرت دلانے کی کوشش کی ہے۔

حاضر العالم الاسلامی۔ میں امیر نے ایک غیر معمولی تاریخی ذخیرہ کے علاوہ یہ بھی کوشش کی ہے کہ اہل یورپ کے خیالات جو اسلام کے متعلق ہیں ان کا تجزیہ کریں۔ وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ یہ لوگ کبھی بھی مسلمانوں کے خیر خواہ نہیں ہو سکتے۔ اس موضوع پر انہوں نے بہت طویل معلوماتی حاشئیے تحریر کئے ہیں۔ علاوہ ازیں اپنے دور کے عرب و ترک ممتاز مسلمانوں کے حالات قلم بند کئے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ کتاب بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ امیر نے ہر ہر ملک کے مسلمانوں پر اس میں الگ الگ حاشئیے لکھے ہیں۔

مسلمان پیچھے رہ گئے اور کیوں دوسرے آگے نکل گئے۔ اس کتاب میں امیر نے مسلمانوں کی اخلاقی و روحانی زندگی کا تجزیہ کیا ہے اور ان کے انحطاط کے اسباب بتلانے کی کوشش کی ہے۔ ان کی نگاہ میں مسلمانوں کے انحطاط کے بہت سے اسباب تھے۔ اجمالاً ان کا خلاصہ یہ ہو سکتا ہے :-

---

[1] حاضرات ملاحظہ ہو ص ۱۴ سے ۲۶ تک

۱. ابتداء میں اگر حضرت علیؓ و حضرت عثمانؓ وغیرہ کے زمانہ میں اختلافات نہ ہوئے ہوتے تو مسلمان پوری دنیا کو فتح کر لیتے۔
۲. غیرت اور عمل کے فقدان نے مسلمانوں کو پستی میں مبتلا کر دیا ہے حالاں کہ قرونِ اولیٰ میں ان کے اندر عمل کا بے پناہ خزانہ موجود تھا اور اس کے برعکس اب ان پر بے عملی طاری ہے۔
۳. ایثار و قربانی کی قوت مسلمانوں میں باقی نہیں رہی ذرا سے نقصان سے وہ ڈر جاتے ہیں۔
۴. جاسوسی وخیانت ان کا عام مرض ہے۔ ہر شخص ذاتی فائدہ کو قومی فائدہ پر ترجیح دیتا ہے۔
۵. انہیں اپنی ذات پر یقین نہیں ہے وہ سمجھتے ہیں کہ ترقی تو یہی مغربی ممالک کر سکتے ہیں۔
۶. امیر علوم جدیدہ پر بہت زور دیتے ہیں اور ترقی کے لئے اسے ضروری قرار دیتے ہیں، یہ بھی مسلمانوں کی پستی کا ایک راز ہے[1]

امیر نے ۵ کتابیں ایڈیٹ کی ہیں۔ اور ان کے علاوہ مندرجہ ذیل کتابیں اور تصنیف کی ہیں (مذکورہ تینوں کتابیں اس شمار سے الگ ہیں۔

۱۔ شوقی واصدقاء اربعین سنۃ ۲۔ السید رشید رضا ۳۔ غزوات العرب فی فرنسا وسویرا و ایطالیا و جزائر البحر المتوسط، اس کا ترجمہ اردو میں نجم الدین شکیب صاحب نے "مشرقی یورپ پر عربوں کے حملے" کے عنوان سے کیا ہے جس کو انجمن ترقی اردو پاکستان نے شائع کیا ہے۔ ۴۔ خاتمۃ تاریخ العرب فی الاندلس[2]

امیر فرماتے ہیں کہ میں ایک منٹ بھی ضائع نہیں کرتا سال کے دوران میں دو ہزار خطوط لکھتا ہوں اور سینکڑوں مقالے۔ انتقال سے کچھ پہلے ۲۰ جلدیں جن میں انہوں نے اپنے دور کے حالات قلم بند کئے تھے وزارتِ خارجہ شام کو سپرد کیں[3]

اگرچہ امیر کی علمی و سیاسی عظمت نے ان کی شاعرانہ صلاحیت کو کچھ دبا سا دیا ہے اس لئے وہ باوجود شاعر ہونے کے اس حیثیت سے معروف نہیں ہیں۔ حالاں کہ ان کا ایک پورا دیوان بھی موجود ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ جو اسلوب انہوں نے نثر میں اختیار کیا وہ نظم میں نہیں کر سکے۔

میں امیر کی شاعری پر زیادہ لکھنا نہیں چاہتا کیونکہ ان کی زندگی کے دوسرے پہلوؤں کے مقابلہ میں اس کی کوئی اہمیت نہیں پھر بھی چند باتیں اس سلسلہ میں ان کی شاعری کے متعلق ایک عام معلومات فراہم کر سکیں گی۔

---

[1] محاضرات ص ۵۰ تا ۱۴۵ [2] مصادر الدراسۃ الادبیۃ جلد دوم مؤلفہ یوسف سعد داغر ص ۹۷، ۹۸ [3] محاضرات ص ۲۳ مصادر الدراسۃ الادبیۃ الجزء الثانی مؤلفہ یوسف سعد داغر ص ۹۷۔

جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے امیر زمانۂ طالب علمی ہی سے مشقِ سخن کرتے تھے اور ان کے اشعار مختلف پرچوں میں شائع ہوتے تھے۔ انہوں نے کبھی بھی اپنے آپ کو شاعری کے لئے وقف نہیں کیا بلکہ وقتاً فوقتاً کبھی کسی تقریب یا کسی اور موقعہ پر شعر کہہ دیا کرتے تھے۔ مختلف واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ امیر کے شاعری کا بہت اچھا سلیقہ تھا اور فطرت سے شاعرانہ طبیعت انہیں عطا ہوئی تھی۔ چنانچہ ۱۹ ہی سال کی عمر میں ان کا ایک دیوان " الباکورۃ" کے نام سے شائع کیا۔ بیروت ۱۸۸۷ء میں، بعد میں ۱۹۳۵ء میں مصر سے دیوان "شکیب ارسلان" کے نام سے شائع ہوا۔ جب شیخ جمال الدین سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے اس جوہر کو تاڑ لیا اور فرمایا "سقیا الارض انبتتک"۔ "سرسبز و شاداب ہو وہ سرزمین جس نے تم کو جنم دیا ہے"

جیسا کہ گذر چکا ہے کہ محمد عبدہ سے جب مدرسہ میں ایک بار ملاقات ہوئی تو انہوں نے پیشین گوئی کی تھی کہ تم آگے چل کر ایک بڑے شاعر ہو گے۔ ان کے ذوقِ شعری کو ایک جانب ان کے گھر کی فضا سے مدد ملی۔ اور دوسری جانب ان کو عبداللہ البستانی جیسا استاد مل گیا جو بہت عمدہ ذوقِ شاعری رکھتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اتنی کم عمری میں وہ بڑے پُرگو شاعر ہو گئے۔

امیر خود بتاتے ہیں کہ میری عمر جب چودہ سال کی تھی جبھی سے اونچے رسائل میں میرے اشعار چھپنے لگے اور دیکھنے والے مجھے شبہ کی نگاہ سے دیکھتے تھے لیکن رفتہ رفتہ انہیں یقین ہو گیا کہ میں شاعر ہوں۔

امیر کا پہلا دیوان جب شائع ہوا تو انہوں نے محمد عبدہٗ کو اس کا ایک نسخہ بھیجا اور ساتھ میں ایک قصیدہ بھی روانہ کیا۔ جو بڑے شاعرانہ اور لطیف رنگ میں ہے جس میں ایک طرف خود شعر کی تعریف ہے اور دوسری جانب اس بات کا بھی ذکر ہے کہ ان کی عمر کم ہے۔

لا غرو ان اهدی الیك دقائقی ‌ و انا رقیق فضائل و مآثر

کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ میں آپ کی جانب اپنے غلاموں (شعروں) کو ہدیہ کروں (جب کہ) میں فضائل کا غلام ہوں۔

لیس القریض سوی تأثر خاطر ‌ ممّا به للمرء قرة ناظر

شعر ایک تاثرِ قلب کے سوا کچھ نہیں ہے جس سے انسان کی آنکھوں کو ٹھنڈک محسوس ہوتی ہے۔

قد باکرتنی قبل صادق فجره ‌ قد کنت من اعوامه فی العاشر

اشعار عمر کی صبح صادق سے پہلے ہی مجھ تک پہنچ گئے حالاں کہ میں عمر کے دسویں ہی سال میں تھا۔

لہ محاضرات عن امیر شکیب ارسلان سامی الدہان ص ۴۳

امیر کو شاعری کے ذریعہ سے اپنی ابتدائی زندگی میں اپنے دور کے مشہور اور اہم لوگوں سے قربت کا موقع ملا۔ اور ان کو اس کی وجہ سے شوقی۔ اسمٰعیل۔ صبری۔ ابراہیم الیازجی اور عبداللہ فکری جیسے اہم شعراء کے ساتھ برابری کے تعلقات رکھنے کا بہت ہی کم عمری میں موقع مل گیا۔ امیر نے اپنے دور کے تمام شعراء کے مقابلہ میں سامی بارودی سے بہت زیادہ اثر قبول کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ امیر قدماء کے طرز شاعری کے دلدادہ تھے۔ اور خصوصاً عصر عباسی کی شاعری کو بہت پسند کرتے تھے اور اس دور کے رنگ میں شعر کہنے کی کوشش کرتے تھے۔ بارودی چونکہ قدماء ہی کا تتبع کرتے تھے اس لئے امیر نے اپنی شاعری میں ان کا تتبع کیا۔ امیر نے بارودی کی مدح میں ایک قصیدہ کہا اور ان کی تعریف کی۔ تو انہوں نے شکیب کی تعریف کا جواب ایک نظم میں بڑی اچھی طرح دیا، وہ کہتے ہیں۔

لك السبق دونى فى الفضيلة فاشتمل بحلتها فالفضل للمتقدم

فضیلت میں تم کو سبقت حاصل ہوئی (نہ کہ مجھ کو) لہذا فضیلت کا لباس پہن لو اس لئے کہ وہ سبقت کرنے والے ہی کو حاصل ہوتی ہے۔

اس کے جواب میں امیر نے ایک دوسری نظم کہی، چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

رأى كرماً فى تذكرى قوله فدلّ على اعلى خلال و أكرم

بارودی نے اپنے تذکرہ میں (میرے یہاں) کرم واچھائی دیکھی تو یہ بات ان کے اعلیٰ اخلاق پر دلالت کرتی ہے

وانت الذى يا ابن الكرام أعدتها لافصح من عهد النواس ومسلم

اور آپ نے عہد ابونواس اور مسلم سے بھی بڑھ کر فصیح شعر کہے۔

امیر اور شوقی میں بڑے اچھے دوستانہ تعلقات تھے۔ شوقی نے اپنے دیوان کا نام "الشوقیات" انہیں کے مشورہ پر رکھا تھا۔

شوقی خود اپنا تعلق امیر سے ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

حرصت عليها آنة ثم آنة كما ضنّ بالماس الكريم خبير

شکیب کے ساتھ رہنے پر بار بار میں حریص ہوا جیسے کوئی جوہری اچھے الماس کے بارے میں بخیل ہوا (ہا ضمیر پہلے شعر میں برہنۃ کی طرف ہے)

فلما تساقينا الوفاء وتسترى وداد على كل وداد امير

جب ہم نے آپس میں وفا کی شراب پی اور ساری محبتوں سے بڑھ کر محبت مکمل ہو گئی

تغرق جسمى فى البلاد وجسمه ولم تتغرق خاطر وضمير

تو ملک میں میرے اور اس کے جسم جدا جدا ہو گئے مگر دل وضمیر ساتھ رہے۔

امیر نے اپنے دیوان کا ایک نسخہ عبداللہ فکری کو بھیجا اور ساتھ میں ایک نظم جس میں ان سے یہ شکایت کی کہ ان کا دیوان غزل سے خالی ہے۔ دو شعر ملاحظہ ہوں۔

جعلت القول فی سیف و رمح وعفت النظم فی قد وخصر

تم نے تلوار و نیزے کے بارے میں باتیں کہیں اور قد و کمر کے بارے میں نظم کہنے سے دامن بچایا

فانی عاشق غرر المعانی ولی نفس۔ فداءلك نفس حر

(لیکن) میں ایک بلند معانی عاشق ہوں اور مجھے ایک آزاد نفس عطا ہوا ہے۔

امیر کے یہ تمام اشعار ان کی مدحیہ شاعری کی مثال پیش کرتے ہیں۔ امیر کو مدح، وصف اور مرثیہ میں امتیاز حاصل تھا اور چونکہ قصائد عموماً انہوں نے بالکل ابتدائی زمانہ میں کہے ہیں۔ اس لئے عباسی دور کا رنگ شاعری ان میں زیادہ نمایاں ہے۔

ان کی شاعری میں اس رنگ کے لئے یہ شعر ملاحظہ ہو:۔

وما کنت ممن یرهق العشق قلبه ولکن من یدری فتونك یعشق

میں ان لوگوں میں نہیں ہوں جن کے قلب کو عشق برباد کرے لیکن جو تمہاری اداؤں سے آشنا ہے وہ عشق کرتا ہی ہے۔

امیر نے جو مرثیہ کہے ہیں ان میں بھی وہی قدما کا رنگ جھلکتا ہے۔ ابراہیم الیازجی کے مرثیہ کے دو شعر ملاحظہ ہوں۔

ایملك حقك لاظلم ولاسرف لا ینکر الشمس، الا فاقد البصر

آپ کا حق بغیر کسی زیادتی کے تسلیم ہے سورج کا انکار نابینا کے علاوہ کوئی نہیں کر سکتا۔

وقل یعاب الذی فی البدر من کلف ولیس یُسلب معنی الحسن فی القمر

چاند کو گہن لگایا جاتا ہے مگر اس سے چاند کے حسن کو فراموش نہیں کیا جا سکتا

اس میں امیر نے اپنی ان تنقیدوں کی جانب بھی اشارہ کیا ہے جو انہوں نے یازجی پر کی تھیں۔

امیر شکیب شوقی کے مرثیہ میں فرماتے ہیں:۔

یبکی الاسلام خیر جنوده ابداً ویرثی الشرق خیر حماته

اسلام اپنے بہترین سپاہی کو ہمیشہ روئے گا اور مشرق اپنے بہترین حامی کا مرثیہ خواں رہے گا۔

ذکان وادی النیل من اجزانه یلغی علی الشیطن من زفراته

گویا کہ وادی نیل ان کے غموں (یعنی غمزدوں) میں سے ہے جو دونوں کناروں پر اپنی آہوں کو پھینک رہی ہے۔

میرا خیال ہے کہ ان کے تمام مرثیوں میں شوقی کے بارے میں یہ پورا مرثیہ بڑی فنکارانہ عظمت کا حامل ہے۔

وصف میں بھی امیر کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ خاص طور سے دو نظمیں اس سلسلہ میں ان کے فن کی ترجمان کہلانے کی مستحق ہیں۔ "قریہ حطین" کی تعریف جو فلسطین میں واقع ہے۔ اور دوسری "مسجد قرطبہ" سے کیا جائے تو امیر کی یہ نظم بالکل بے حقیقت ہو کر رہ جائے گی۔ کیونکہ اس میں وہ ذہنی و فلسفیانہ بلندی نہیں ہے۔ جو اقبال کی نظم میں موجود ہے لیکن اس کے باوجود امیر کی نظم میں ایک حسرت انگیز منظر نگاری قابلِ تعریف ہے۔ اب چند اشعار اس نظم کے ملاحظہ ہوں۔

تامّل یا خلیلی کم ھنا من مھلل الی ربہ صلیّ وکم من مکبّر

اے میرے دوست ذرا سوچو کہ (اس مسجد میں) کتنے لوگوں نے نمازیں پڑھی ہیں

وکم ازھرت فیہ الوف مصالح وکم اوقدات ارطال عود و عنبر

اور کتنے نیک لوگ اس میں جلوہ افروز رہے اور کتنی خوشبوؤں سے یہ مسجد معطر رہی

خلیلی تأمل کالعرائس تنجلی اساطین قد تحصی بالالف واکثر

میرے دوست غور کرو تو تمہیں ہزاروں ستون دلہن کی طرح مرصع نظر آئیں گے۔

تراھا صفوفاً قائمات کانما تخاطبنی الارواح من کل مقبر

اور میں محسوس کرتا ہوں کہ میں اپنے ملک میں ہوں اور گویا یہاں روحیں ہر قبر سے مجھ سے باتیں کر رہی ہیں

وانی اری بالعین مالم اکن اری حقیقۃ فی وصف طرس و مزبر

اور میں آنکھوں سے وہ دیکھ رہا ہوں جس کو میں دیکھنے والا نہ تھا۔

امیر نے شاعری کیوں ترک کردی؟ واقعہ یہ ہے کہ اس سلسلہ میں کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ جب اتنی چھوٹی عمر میں انہوں نے اتنی شہرت حاصل کر لی تھی تو وہ اگر مشق سخن کرتے رہتے تو یقیناً اپنے دور کے صفِ اول کے شعراء میں ہوتے۔ عام خیال یہی ہے کہ محمد عبدہٗ کی ملاقات اور قومی و ملی درد نے ان کو نظم سے نثر کی جانب مائل کر دیا اور وہ امیر الشعراء ہونے کے بجائے "امیر البیان" ہو گئے۔ وہ خود اپنے شعر کو ترک کرنے کا ذکر یوں کرتے ہیں۔

وکنت ملک الشعر حتی کرھتہ و اصبح عندی فی عداد المحارم

میں ملک الشعر تھا یہاں تک کہ میں نے شعر کو ناپسند کیا اور شعر کہنا میرے نزدیک گناہوں میں داخل ہو گیا۔

اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ امیر کے اسلوبِ نثر پر ایک بحث کی جائے اور ان کے امیر اللسان و امیر البیان ہونے کے بعض گوشے سامنے کئے جائیں۔ تاکہ ان کی عظمت کا یہ پہلو بھی نمایاں ہو جائے۔

امیر نے اگر شعر کا میدان چھوڑ دیا تو کیا ہوا انہوں نے نثر میں وہی شہرت حاصل کر لی۔ امیر کے اسلوبِ نثر کے بارے میں بڑے اختلافات ہیں۔ امیر قدیم اسلوب کسی حد تک پسند کرتے تھے وہ خود کہتے تھے کہ میں قدیم ادب واسلوب سے اپنا رشتہ منقطع کرنا پسند نہیں کرتا، اور کہتے تھے کہ مترادفات کا بھی ایک مقام ہے۔ امیر اور خلیل اسکاکینی میں اسلوب کے بارے میں بڑے مباحثہ ہوئے لیکن امیر نے ان کی رائے کو تسلیم نہیں کیا اور کہا کہ ادب کا ایک خاص اسلوب ہے علم وفن اسی اسلوب میں پیش کئے جاتے ہیں۔ اور یہی عرب کا طریقہ ہے بعد میں کچھ اس انداز کی بحث طٰہٰ حسین اور مصطفےٰ صادق الرافعی کے درمیان ہوئی[1]۔ رافعی امیر کے ساتھ تھے واقعہ یہ ہے کہ امیر کا اسلوب نہ بالکل قدیم ہے اور نہ بالکل جدید بلکہ دونوں اسلوبوں کی آمیزش سے ان کا اسلوبِ عبارت ہے۔ یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ امیر کے مقالات اور خطوط وغیرہ میں تجدد کی طرف زیادہ میلان ہے اور ان کی کتابوں میں جو اسلوب ہے اس کا جھکاؤ عصر عباسی کی جانب ہے جس میں مترادفات، کہیں کہیں مقفٰی جملے اور طویل طرزِ تحریر ہے۔ اس میں تو شبہ نہیں کہ امیر کا اسلوب جدید نہ تھا لیکن قدیم اسلوب کی صف میں بھی اس کو رکھنا ذرا مشکل ہے۔ ہاں اسے ایک پُرشوکت اسلوب سے ضرور تعبیر کیا جا سکتا ہے جو اس دَور میں اکثر ناقدین پسند نہیں کرتے۔

اس سلسلہ میں امیر کی رائیں اور مناقشات کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں اپنے اسلوب کی صحت اور صداقت نیز ادبیت پر کوئی شبہ نہیں تھا اور اس طرزِ اسلوب کو وہ نثر کا بہترین اسلوب تصور کرتے تھے اور اسی کو وہ عرب کا ادبی اسلوب تصور کرتے تھے[2]۔

امیر کے اسلوب پر قدما کی مہرِ صداقت ثبت ہے۔ اور ان کے عمدہ رنگوں کا بہترین امتزاج نظر آتا ہے اور اس پر لطفِ بیان وقدرتِ زبان ذرا دیکھئے کہ باوجود اس کثرتِ تصانیف امیر کے یہاں اسلوب کی رکاکت عدم یکسانیت اور اضمحلال تراکیب کا کہیں بھی وجود نہیں ہر جگہ قاری ایک متین ورصیف نیز مرصّع اسلوب پائے گا۔ یہ بات پوری طرح اس امر کا ثبوت پیش کرتی ہے کہ امیر واقعی امیر بیان تھے۔

امیر کے اسلوب میں حسنِ ترتیب اور بیان کی مجموعی کشش ہر جگہ کارفرما نظر آتی ہے۔

امیر لمبے لمبے جملوں میں حسین دقفات کا ایک بڑا اچھا نثری طرزِ عبارت پیش کرتے ہیں گویا ایک لمبے کو کئی جگہ سے مناسب موقعوں پر کاٹ کر وہ اثر وکشش پیدا کر دیتے ہیں جو دراصل مختصر جملوں کا سارا سرمایہ ہے اس سلسلہ میں امیر کو جو ایک قدرتی عطیہ حاصل ہے وہ ہے ان کے اندر ایک فطری سلیقہ حسین مترادفا

---

[1] حاضرات ص ۱۰۲، ۱۰۵، ۱۱۰ [2] ایضاً ص ۱۰۳ تا ۱۰۵

کے اجتماع کا موجود ہے۔

صادق الرافعی کے یہاں کچھ اس طرزِ کا نثری اسلوب ملتا ہے مگر یہ کہنے میں ذرا بھی جھجک نہیں کہ وہ قوافی اور مترادفات میں ذرا زیادہ الجھ جاتے ہیں جس کی وجہ سے پڑھنے والا قافیوں کے وجود کا بسا اوقات احساس کرنے لگتا ہے۔ مگر امیر کے یہاں ایک ایسی روانی اور بے ساختگی نظر آتی ہے کہ قافیہ یا بندش کا احساس ہونے کے بجائے ایک فطری روانی میں لذتِ اسلوب سے قاری سرشار ہو جاتا ہے۔

جہاں تک غریب الفاظ کے استعمال کا تعلق ہے وہاں صادق الرافعی، لطفی منفلوطی اور تقریباً سب یکساں ہیں اور جس طرح طٰہٰ حسین کی کتابیں پڑھتے وقت یہ ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ لغت اٹھائی جائے بلکہ قدماء ابن مقفع اور ابو الفرج الاصبہانی کی عبارتوں کی طرح ہر بات آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے۔

مذکورہ تینوں حضرات کے یہاں زیادہ نہیں کسی حد تک غریب اور مشکل الفاظ جا بجا ضرور مل جاتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے نصف اول میں مصر و عرب میں اسلوب کے بارے میں اہلِ نظر ادباء دو بڑے مکتب خیال میں بٹے رہے۔ ایک جدید اسکول ہے جو ہر قسم کی قدامت سے مبرّا اور اور بالکل سیدھے سادے اسلوب پر زور دیتا ہے۔ دوسرا اسکول قدیم الخیال ہے اور بالکل تجدد اختیار کرنے کو قدماء سے اپنا رشتہ ختم کر لینے کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔ پہلے اسکول میں بیسویں صدی کے ممتاز لوگوں میں طٰہٰ حسین۔ احمد امین۔ عباس محمود عقاد اور خلیل جبران وغیرہ ہیں۔ دوسرے اسکول کے ممتاز صاحبِ طرز ادباء میں منفلوطی۔ صادق الرافعی۔ احمد حسن زیات اور خود امیر شکیب ہیں[۱]۔

بہرحال کچھ بھی ہو امیر کے اسلوب میں پڑھنے والے کو زبان و بیان کا ایک جادو نظر آتا ہے اور ان کے تمام معاصرین کو امیر کی اس عظمت کا پورا احساس و اعتراف ہے سوا بعض غالی قسم کے لوگوں کے جیسے سکاکینی وغیرہ جو امیر کے اسلوب کو از کار رفتہ سمجھتے تھے[۲]۔

---

[۱] صادق الرافعی اور طٰہٰ حسین کے درمیان اس بحث کا مطالعہ "حدیث الاربعاء" مصنفہ طٰہٰ حسین میں ملاحظہ ہو۔ الی الدکتور طٰہٰ حسین کے عنوان کے تحت رافعی کا خط اور اس کا جواب　[۲] محاضرات ص ۱۰۵

ایگل
ایک عالمگیر
قلم
EAGLE
خوشخط
رواں اور
دیرپا۔
اسٹیل
کے
سفید
اریڈیم ٹپڈ
نب کے
ساتھ،
ہر
جگہ
دستیاب
EAGLE
IRIDIUM
آزاد فرینڈز
اینڈ کمپنی لمیٹڈ

دلکش
دلنشیں
دلفریب
حسین
کے
پارچہ جات
مرد و زن کے ملبوسات کیلئے موزوں، حسین کے پارچہ جات شہر کی ہر بڑی دکان پر، دستیاب ہیں۔
حسین کے خوبصورت پارچہ جات نہ صرف آنکھوں کو بھلے لگتے ہیں بلکہ آپ کی شخصیت کو بھی نکھارتے ہیں۔
FABRICS
خوش پوشی کے پیش رو
حسین ٹیکسٹائل ملز
حسین انڈسٹریز لمیٹڈ کراچی
کا ایک ڈویژن

قومی خدمت ایک عبادت ہے
اور
سروس انڈسٹریز اپنی صنعتی پیداوار کے ذریعے
سال ہا سال سے اس خدمت میں مصروف ہے
Servis

سید تصدق بخاری

جبهہ و جبین
لغوی علمی اور تحقیقی بحث

جب سے ماہنامہ الحق میں جبین کی بحث شروع ہوئی ہے ملک و بیرون ملک سے اس موضوع پر کثرت سے مضامین، مقالے اور خطوط موصول ہو رہے ہیں الحق کے محدود صفحات کے پیش نظر صرف ان ہی حضرات کے مضامین کو ترجیح دی جاتی ہے جنہوں نے اولاً بحث شروع کی یا پھر جن کا مضمون اپنے موضوع ہی تک محدود رہا۔ قارئین کا ایک وسیع حلقہ علمی اور تحقیقی ذوق کے پیش نظر اس سلسلۂ تحقیق کو پسند بھی کرتا ہے اور حصہ بھی لینا چاہتے ہیں ہم باحثین و شائقین کے اصرار پر اس سلسلہ کی چند مزید اقساط بھی نذر قارئین کر رہے ہیں۔ (ادارہ)

جبہہ و جبین کی تحقیق انیق و تدقیق عمیق

حضرات قارئین کرام! موقر مجلہ الحق نومبر ۱۹۹۲ء کے شمارہ ۲ میں جناب پروفیسر حمداللہ قریشی صاحب کا مقالہ جبین کا معنی پیشانی بھی ہے، کے زیر عنوان نظر سے گزر کر بصیرت نواز ہوا جو راقم آثم کی تردید و اصلاح کیلئے موصوف نے حموضت و مرارت کی کلک سے ارقام فرمایا ہے۔ موصوف کی اس تحریر کو پڑھ کر احقر الاثیم راجی رحمت ربہ الکریم کلیجہ مسوس ہو کر رہ گیا کہ محترم پروفیسر صاحب جبین و جبہہ کی متعین شدہ حدود سے قطعی ناواقفی کی وجہ سے اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ جبین کا معنی پیشانی بھی ہے۔ حال آنکہ امر واقعہ یہ ہے کہ عربی کی کسی معتبر لغت یا ثقہ حدیث میں یہ نہیں ہے کہ جبین کا معنی پیشانی بھی ہے اس کے برعکس ابن سیدہ[1] کی ام اللغت المحکم کی بنا پر علامہ امام رازیؒ فرماتے ہیں جبین کا معنی پیشانی کرنا غلط ہے۔ کما مر ۔ اگر جبہہ یعنی پیشانی کی متعینہ حد، کنف و کنارہ سے واقف ہوتے تو موصوف اس ذہول کے مرتکب نہ ہوتے کہ جبین کا معنی پیشانی بھی ہے درحقیقت بات یہ ہے کہ جبہہ کی تقصیر حد اور جبین کی وسعت حد و کنف سے بُعد

[1] ان کا پورا نام۔ ابوالحسن علی بن اسمٰعیل بن سیدہ الاندلسیؒ ہے۔ توفی ۴۵۸ھ انہوں نے ام اللغت المحکم لکھی ہے ان العرب کی اصل زمین یہی ہے۔

ہی کی وجہ سے موصوف جبین کو جبہہ کہنے پر مصر ہیں۔ سچ ہے کہ

اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شئے کی حقیقت کو نہ سمجھے وہ نظر کیا

راقم آثم اپنے کرم فرما منتقد جناب پروفیسر صاحب موصوف سے محترمانہ مرافعہ گزار ہے کہ اس لاشئی کی، الحق دسمبر ۱۹۹۱ء کے شمارہ میں مرافعانہ گذارشات اور زیر نظر مرافعت کو بنظر امعان ملاحظہ فرما کر ثلج صدر کے ساتھ منصفانہ تحقیق و تدقیق اور کنج کاوی فرمائیں تاکہ آپ کے سامنے یہ بات اجلی واسنی ہو کر آجائے کہ جبہہ و جبین شئی واحد نہیں ہے بلکہ الگ الگ دو چیزیں ہیں جن کا ایک دوسرے پر انطباق و اطلاق نہیں ہوتا نہ ہو سکتا ہے۔ قبل اس کے کہ میں قارئین عظام کو یہ بتاؤں کہ جبہہ و جبین کا محل وقوع کہاں ہے یعنی جبہہ کس جگہ کو کہتے ہیں اور جبین سر کے کس حصہ کا نام ہے۔ پہلے جناب پروفیسر صاحب کی تحریر کو علمی کسوٹی پر کس کر دیکھتے ہیں کہ اس کا کس نوع سے تعلق ہے اور اسکی کنہہ کیا ہے۔

الحق نومبر ۱۹۹۲ء کے شمارہ ۲ کے صفحہ ۴۳ سے ۴۷ تک پانچ صفحات پر موصوف کا مقالاتی مضمون پھیلا ہوا ہے جس میں آپ خامہ فرسا ہیں کہ،

امام بخاریؒ اور دوسرے محدثین نے وان جبینہ لیتفصد عرقاً کے جو الفاظ حضرت عائشہؓ کی زبانی نقل کئے ہیں اس کی تفصیل دوسری روایات میں ملتی ہے جس سے یہ بات نکھر کر سامنے آتی ہے کہ یہ پسینہ[1] کہاں سے پھوٹتا تھا۔

ہشام کے والد نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اس بارے میں جو روایت نقل کی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں قالت ان کان لینزل علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی الغداۃ الباردۃ ثم تفیض جبہتہ عرقاً۔ (مسلم ج ۲ ص ۲۵۷)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ٹھنڈی صبح میں وحی اترتی تو آپ کی پیشانی سے پسینہ بہتا۔ بات بالکل واضح ہو گئی کہ جس روایت میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جبین کا لفظ استعمال کیا ہے وہاں اس سے انکی مراد پیشانی ہے۔ بلفظہ۔

حضرات قارئین کرام! کاش کتنا اچھا ہوتا کہ زیر نظر مقالہ لکھنے سے پہلے موصوف حدیث کے اسرار و رموز اور مضمرات و مکنونات پر بصیرت کی نظر عمیق ڈال لیتے یا چٹائی پر بیٹھ کر احادیث پڑھانے والے کے

---

[1] موصوف کا یہ املا غلط ہے۔ صحیح املا پسینا ہے نہ کہ پسینہ۔ بعض اردو لغات میں یہ املا ہونے سے صحیح نہیں ہو سکتا۔

کہنہ مشق شیخ الحدیث سے ہی ان احادیث کی تطبیق وتضاد کے متعلق استفسار فرما لیتے تو موصوف کو توضیح و توثیق سے معلوم ہو جاتا کہ ثم کا لفظ لانے کا مطلب یہ ہے کہ جبین سے پسینا اتنا کثرت سے نکلتا تھا کہ جبین کی دائیں بائیں کی دونوں حدوں سے گزر کر جبہہ یعنی پیشانی سے بھی بہنے لگتا۔ حدیث کے سیاق وسباق سے شناسائی کے فقدان کی وجہ سے موصوف اس خوش فہمی میں گم ہو کر رہ گئے ہیں کہ جبین کا معنی بھی پیشانی ہی ہے۔ اگلے صفحہ پر موصوف کا قلم یوں گوہر ریز ہے۔ آیئے ذرا آگے بڑھتے ہیں حضرت ابوسعید خدریؓ نے ابوسلمہ سے لیلۃ القدر کے بارے میں جو حدیث بیان کی ہے اس میں یہ ہے کہ رمضان کی اکیسویں رات کی صبح کو جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نماز فجر سے فارغ ہوئے تو ان کے جبہہ مبارک پر مٹی کا اثر تھا۔

الفاظ یہ ہیں:- فرایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یسجد فی الماء والطین قال حتی رایت اثر الطین فی جبھتہ۔ (مسلم ج ۱ صفحہ ۳۷۳)

میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پانی[1] اور مٹی میں سجدہ لگاتے ہوئے دیکھا یہاں تک کہ ان کی پیشانی مبارک پر میں نے مٹی کے اثرات دیکھ لیے۔

اب یہی خدریؓ اس حدیث کو دوسرے لوگوں کو ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں۔ فخرج حین فرغ من صلوۃ الصبح وجبینہ وروثۃ انفہ فیھما الطین والماء۔ (مسلم ج ۱ صفحہ ۳۷۰)

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صبح کی نماز پڑھ کر نکلے تو ان کی جبین اور ناک کے بانسے پر مٹی اور پانی کا نشان تھا۔ یہ صحابی ایک جگہ جبہہ اور دوسری جگہ جبین کا لفظ کیوں بولتے ہیں؟۔ اس لیے کہ ان کے ہاں دونوں کے معنی پیشانی ہیں۔ بلفظہ۔

قارئین کرام، یہاں حدیث کا منشا وہ نہیں ہے جو مقالہ نگار نے اپنا موقف ثابت کرنے کے لیے تحریر کیا ہے بلکہ حدیث کا اصل منشا یہ ہے کہ راوی نے جبہہ کے بعد جبین کو کیچڑ آلود، گارے کے نشان کو یقینی بنانے کے لیے بتایا ہے۔

اگر صرف یہ کہا جاتا کہ جبہہ یعنی پیشانی مبارک پر گارے کا اثر تھا تو سامعین یہ سمجھتے کہ مسجد کا فرش کچا تھا۔ اس لیے مٹی کا نشان پیشانی مبارک پر معمولی سا لگ گیا ہوگا ایک جگہ یا دونوں جگہ صرف جبہہ کا لفظ استعمال کرنے سے لیلۃ القدر کی اہمیت ظاہر نہ ہوتی بایں وجہ یہ فرمایا کہ پیشانی مبارک پر کیچڑ کا نشان اتنا واضح تھا کہ وہ جبہہ سے گزر کر جبین تک پھیلا ہوا تھا۔ فافھم وتدبر

پھر صفحہ ۲۶ پر موصوف اپنے موقف کی تائید میں فرماتے ہیں، قرآن کریم میں ہے:۔ یوم یُحمٰی

---

[1] پانی اور مٹی کا صحیح ترجمہ گارا یا کیچڑ ہے۔ پورا ترجمہ تصحیح طلب ہے۔

عَلَيْهَا فِي نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ۔ (التوبہ ۳۵)

ایک دن ایسا آئے گا کہ اسی سونے چاندی پر جہنم کی آگ دھکائی جائے گی اور پھر اسی سے ان لوگوں کی پیشانیوں اور پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا یہ ہے وہ خزانہ جو تم نے اپنے لیے جمع کیا تھا، لو اب اپنی سمیٹی ہوئی دولت کا مزہ چکھو۔ جباہ جبہہ کا جمع ہے جس کا معنی پیشانی ہے اور اس میں کسی کا اختلاف نہیں اب دیکھیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس آیت کی تشریح فرماتے ہوئے جبہہ کی جگہ کس لفظ کا استعمال فرماتے ہیں۔

عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مامن صاحب ذھب ولا فضۃ لا یؤدی منھا حقھا الا اذا کان یوم القیامۃ صفحت لہ صفائح من نار فاحمی علیھا فی نار جھنم فیکوی بھا جنبہ وجبینہ وظھرہ۔ (مسلم ج ۱ صفحہ ۳۱۸)	کوئی سونے چاندی کا مالک نہیں جو اس کی زکوٰۃ نہ دیتا ہو، مگر وہ قیامت کے دن ایسا ہوگا کہ اس کی چاندی سونے کے تختے بنائے جائیں گے اور وہ جہنم کی آگ میں گرم کئے جائیں گے پھر اس کی جبین اور کروٹیں اور پیٹھ داغی جاویں گی۔ بلفظہ

قرآنی آیت میں لفظ جبہہ استعمال کیا گیا ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جبہہ[1] کی جگہ جبین کا لفظ استعمال فرمایا ہے جس سے مکرم ومحترم جناب پروفیسر صاحب اس خوش فہمی میں مبتلا ہو گئے ہیں کہ نبی علیہ السلام نے بھی جبہہ کی جگہ لفظ جبین بول کر جبین کا معنی پیشانی ہی بتایا ہے حالانکہ رسول خدا نے جبین کا معنی پیشانی نہیں بتایا بلکہ آپؐ نے قرآنی لفظ جبہہ کی جگہ لفظ جبین لا کر قرآنی آیت کی تفسیر وتشریح فرماتے ہوئے اس بات کی تصریح فرما دی ہے کہ مانعین زکوٰۃ کی جباہ یعنی پیشانیوں پر ہی چھوٹے چھوٹے[2] داغ نہ ہوں گے بلکہ یہ داغ ان کی پیشانیوں کے دائیں بائیں ان کی جبینوں تک لگے ہوئے ہوں گے۔ لفظ جبین بول کر نبی علیہ السلام نے مانعینِ زکوٰۃ کو دیئے جانے والے داغوں کی المناک تصویر اور ان کی ذلت ورسوائی کا نقشہ کھینچ کر بتایا ہے نہ کہ جبین کا معنی پیشانی بتایا ہے۔ یاد رہے کہ قرآنی لفظ جُنُوْبُهُمْ، جَنْب کی جمع ہے جس کا معنی پہلو، جہت اور جانب ہے اور جنب کا لفظ بدن کے پہلو اور پیشانی کے پہلو، چاروں کا محیط ہے۔ جنوب میں جبین بھی شامل ہے اس لیے قرآن نے صرف لفظ جُنُوْبُهُمْ بولا ہے اسے ہر آدمی نہیں سمجھ سکتا۔ اس لیے نبی اکرم

[1] درحقیقت نبی علیہ السلام نے جبہہ کی جگہ جبین نہیں بولا بلکہ جنوبھم کی تفسیر کے لیے لفظ جبین سے جَنْب یعنی پہلو جہت کی وضاحت فرمائی ہے۔ [2] کیونکہ خود پیشانی چھوٹی سی جگہ کا نام ہے۔

صلی اللہ علیہ وسلم نے لفظِ جبین بول کر یہ وضاحت و صراحت فرمادی ہے کہ جُنُوبُہُمْ میں جبین بھی شامل ہے جبہہ وجبین کے محل وقوع اور توسع وتعمق سے بے خبری کی وجہ سے ہی محترم پروفیسر صاحب جبین کو جبہہ سمجھ بیٹھے ہیں۔

جبہہ وجبین کا محل وقوع اور اطراف و اکناف مع امثلہ

بہت سے غیر ملکی زبان کے الفاظ ایسے ہوتے ہیں جو اہل ملک کی قومی زبان کے الفاظ پر اپنا سایہ ڈال کر ان کو اپنے سائے کے پردے کے پیچھے رکھ کر ان کی جگہ خود لے لیتے ہیں مثلاً آپ حج کے لیے تشریف لے جائیں تو حرمین شریفین کے دربانوں کو آپ یہ کہتے ہوئے پائیں گے کہ یلّہ یلّہ یلّہ، جس کا معنی ہے جلدی چلو جلدی چلو جلدی چلو۔ یہ فارسی کا لفظ ہے۔ عربی میں اس کا تلفظ یاآلّہ کرتے ہیں اس کا معنی آؤ بھی ہے اور آگے بڑھو بھی۔

موسیقی، یونانی ہے لیکن ہماری لغت کی کتابوں میں اسے عربی لکھا ہے۔ اس کا معنی ہے۔ الفاظ کی زیر و بم، اتار چڑھاؤ۔ آواز کی کھینچ تان۔ فیروز اللغات ص ۱۱۲۵، لغات سعیدی ص ۷۹۷ میں اسے عربی لکھا ہے۔ فلسفہ PHILOSOPHY یونانی ہے۔ ہماری کتب لغات میں اسے عربی بتایا گیا ہے، یونانی میں فیلا یعنی دوست اور سوف، یعنی حکمت سے مؤرد اور معرّب ہو کر فلسفہ بن گیا۔

اسطرلاب۔ ASTROLABE معرب یونانی سے معرب ہے۔ امریکہ میں جو ٹمبیکو[1] تھا وہ برصغیر میں آکر تمباکو بن گیا ہے لیکن انگلینڈ اور امریکہ والے تمباکو نہیں بلکہ ٹمبیکو ہی بولتے ہیں۔ اس پر جبین کو بھی قیاس کر لو۔ لن ٹرن۔ LANTERN لندن سے آکر برصغیر میں لالٹین۔ بتی۔ بن گئی۔ لالٹین۔ لن ٹرن کا مؤرد ہے اور لنترہ، لالٹین کا ہی مفرس ہے۔

آصف۔ عبرانی ہے جس کا معنی ہے اکٹھا کرنا، جمع کرنا، پاک کرنا، ضبط کرنا۔ آصف برخیا سیدنا سلیمانؑ کا وزیر تھا اس کا استعمال اردو میں بھی ہے۔

کد اور کدہ، فارسی ہے جس کا معنی ہے گھر۔ لیکن یہ فارس سے چل کر جب برصغیر میں وارد ہوا تو گڈھ پھر گڑھ پھر گھر بن گیا۔ لیکن اب بھی دولت گڈھ یا دولت گڑھ کوئی نہیں لکھتا بلکہ دولت کدہ ہی لکھتے اور بولتے ہیں اسی طرح جبین عربی ہے جس کا معنی ہے طرف، جانب، جہت، کروٹ۔ لیکن جب جبین فارس میں آیا تو فارسیوں نے اسے جبین سے پیشانی بنا دیا۔ فارس سے ورود ہند کے بعد اسے پیشانی ہی کہنے لگے۔ کماسیاتی پھر اور دیکھئے۔ کندہ فارسی ہے لیکن جب سے سیدنا سلمان فارسیؓ کے ساتھ مدینہ منورہ میں پہنچا تو وہاں

---

[1] ٹوبکے کو۔ TOBACCO

سے مقام اُحد کے قریب غزوہ احزاب میں پہنچ کر خندق بن گیا۔ ثابت ہوا کہ خندق کندہ کا معرب ہے۔ خندق کھودنے کا مشورہ حضرت سلمان فارسیؓ نے ہی دیا تھا۔ افیون کو لغات سعیدی میں عربی لکھا ہے جو کہ غلط ہے فیروز اللغات صـ۹۹ پر بھی عربی لکھا ہے۔ افیون، ابیون۔ APION کا معرب ہے اور ابیون یونانی ہے جس کا معنی ہے گہری نیند سلانے والی۔ گویا ابیون یونان سے عرب میں آکر افیون کہلایا اور برصغیر میں پہنچ کر افیون اور افیم ہی کہلاتا ہے۔

اسی طرح القِطّ جس کو جمع قطاط آتی ہے اور اس کا معنی بلی ہے قط جب سفید فام لوگوں کے پاس آئی تو وہ کیٹ CAT کہنے لگے اور فارسی میں اسے گربہ کہتے ہیں۔ پھر عربی میں بلی کو السنّوْر اور السنّار بھی کہتے ہیں اس کی جمع سنانیر آتی ہے۔ الہر۔ بلا اس کی جمع ھِرَرَۃٌ ہے۔ ھِرّۃٌ اس کا مونث ہے اور ھِرَرٌ جمع ہے اور ھُرَیْرَۃٌ، ھِرّۃٌ کی تصغیر ہے۔ بلی کے بچوں سے کھیلنے کی وجہ سے ایک صحابی رسول کو ابوہریرہؓ کہتے ہیں۔ مقبوضہ کشمیر میں بعض خاندان بلی کو حُرّ کہتے ہیں اور وجہ تسمیہ یہ بتلاتے ہیں کہ یہ الحر بالحر پڑھتی ہے اور دیکھئے روئی کو عربی میں القطن کہتے ہیں روئی فروش کو القطان اور جس زمین میں کپاس بیج کر روئی حاصل کرتے ہیں اس خطہ زمین کو۔ المقطنۃ کہتے ہیں یہی قطن جب لندن میں نازل ہوئی تو وہاں اسے کاٹن COTTON کہنے لگے۔

انگریزی میں جو کیرٹ CARROT ہے وہ فارسی میں گذر اور ہندی میں گجر اور اُردو میں گاجر کہلاتی ہے عربی میں معرب ہو کر جذر کہلائی پھر فارسی میں اسے زروک بھی کہتے ہیں۔ سنسکرت میں گرجبتن اور گرجن، گاجر کو کہتے ہیں ان الفاظ کی صوتی مماثلت پر ذرا غور فرمایئے کہ لسانیات میں یہ کیا سے کیا بن کر رہ گئے ہیں۔

قارئین کرام! یہ صرف نمونہ و مثال کے طور پر چند الفاظ پیش کئے گئے ہیں ورنہ ہزاروں الفاظ ایسے اور بھی بتائے جا سکتے ہیں جو ایک زبان خصوصاً عربی فارسی اور سنسکرت سے دوسری زبانوں میں جا کر اپنی صوتی و لفظی مماثلت کو قائم رکھے ہوتے ہیں یا اپنی حقیقت سے ہی محروم کر دیئے گئے ہیں مثلاً فارسی میں جو مادر ہے وہ انگریزی میں مدر بن گئی ہے اور فارسی کا پدر لندن میں جا کر فادر بن گیا ہے۔ یہی حال فارسی کے برادر کا ہے جو انگریزی میں جا کر برَدر بن گیا ہے۔ لسانیات کے اس رتق و فتق یعنی فصل و وصل اور انقلابات سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جبین و جبہہ عربی میں تو اپنے اصل مقام پر قائم ہیں لیکن عجمیوں نے ان کا حلیہ[۲] بگاڑ کر رکھ دیا ہے

[۱] تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو احقر کی کتاب "غزوات اور فلسفۂ غزوات"۔ [۲] جیسا کہ آجکل انگریزی خواں اُردو کا حلیہ بگاڑ رہے ہیں۔ وہ بی بی، بیگم، خانم، خاتون، بانو، محترمہ، نجیبہ جیسے الفاظ کی موجودگی میں متفرنج بننے کیلئے میڈم MADAM کو مؤنث کر کے مادام بولتے ہیں اور مباحثہ، مکالمت، مکالمہ، بحث، مکاہرہ، معادلت، معادلہ، مصارقت کو فورم FORUM بولتے ہیں۔

فافھموا وتدبروا وتفکروا۔

ذرا غور فرمائیے کہ انگریزوں نے جبل الطارق کو جبرالٹر بنا کر رکھ دیا ہے اور خود یہ بھی بھول گئے ہیں کہ جبل الطارق کو اس سے پہلے وہ کس نام سے موسوم کرتے تھے؛ لیکن ہمارے مورخ جانتے ہیں۔

مقامِ جبہہ جبہہ چہرے کا وہ حصہ جو دونوں ابرووں کے درمیان ہوتا ہے۔ دونوں ابرووں کے درمیان کا حصہ ہی پیشانی ہے اور اسی پیشانی کے دائیں اور بائیں کو جبین کہتے ہیں۔ ملاحظہ ہو نور اللغات م ۲ صفحہ ۳۱ لعلامہ نور الحسنؒ ۔ جبہہ و پیشانی کی نشاندہی کرتے ہوئے شعورؔ نے بڑے کام کی بات کہی ہے کہ

یار کی پیشانی پُر نور سے کیا دوں مثال
جبہہ خورشید بے ابرو نظر آیا مجھے

اُردو کے شاعر نے اس شعر سے ثابت کر دیا ہے کہ حاجبین یعنی ابرو پیشانی میں شامل نہیں ہیں پیشانی ان کے درمیانی حصہ کو کہتے ہیں۔ عربی لغت کے امام علامہ ابن منظورؒ بھی جوں کے توں رقمطراز ہیں۔

والجبھۃ : موضع السجود وقیل ھی مُستَوَی ما بین الحاجبین الی الناصیۃ وجمعھا جباہٌ[1]۔ وجبھۃ القوم۔ سردارقوم۔ وجبھۃ من الناس الجاعۃ۔ منتھی الارب، لسان العرب، المنجد، المحکم، لابن سیدہؒ	یعنی سر کے مقامِ سجدہ کو جبہہ (پیشانی) کہتے ہیں۔ اور کہا جاتا ہے کہ وہ یعنی جبہہ دونوں ابرووں کے درمیان سر کے بال نکلنے کی منتہا تک (پیشانی) ہے اور اس کی جمع جباہ آتی ہے۔ جبین کا معنی پیشانی وہ لوگ کرتے ہیں جو جبہہ و جبین کی حد اور حصہ کا علم نہیں رکھتے۔

حضرات قارئین کرام! ایجاز و اختصار سے لکھے گئے ان اقتباسات سے یہ بات اجلیٰ واسنیٰ ہو گئی ہے کہ جبہہ یعنی پیشانی سر کے اس حصہ کو کہتے ہیں جو سجدہ کرتے وقت زمین پر لگتا ہے اور یہ دونوں ابرووں کے درمیان سر کی طرف اوپر جاتے ہوئے بال نکلنے کی منتہا تک ہے پیشانی زیادہ سے زیادہ اپنے ہاتھ کی تین انگلی چوڑی ہوتی ہے اس کے دائیں اور بائیں طرف جبین ہے اس حد و امتیاز کو نہ جاننے والے جبین کا معنی پیشانی کرتے ہیں۔ فافھم وتدبر

مقامِ جبین جبینؔ پیشانی کی ایک جانب، جبہہ کے دائیں اور بائیں طرف کا حصہ جبین ہے فارسی میں مطلق پیشانی۔ سعیدی صفحہ ۲۲۱۔ جبین ابرو کے اوپر جبہہ یعنی پیشانی کی دونوں طرفیں۔ فارسیوں نے بمعنی پیشانی استعمال کیا ہے۔

---

[1] جبین کا تثنیہ جبینان ہے اور جمع جُبُنٌ ہے۔ اجبنۃ بھی اس کی جمع ہے۔

محترم پروفیسر حمد اللہ صاحب نے علامہ اقبال مرحوم کا بقرار زیر شعر پیش کرکے کہا ہے کہ اُردو زبان میں تو یہ لفظ (جبین) صریحاً پیشانی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے آخر یہ لفظ اُردو میں کہاں سے آیا؟

؎ تو اپنی سرنوشت اب اپنے قلم سے لکھ
خالی رکھی ہے خامۂ حق نے تیری جبین

ملاحظہ ہو ماہنامہ الحق جنوری ۱۹۹۲ء ص۳۲۔

اب جناب پروفیسر موصوف کو یہ علم ہو جانا چاہیئے کہ جبین کا حلیہ فارسیوں نے بگاڑ کر اُردو کو تحفہ دیا ہے اور اُردو کی پیدائش کے وقت برصغیر پاک و ہند میں سرکاری دفتری زبان فارسی ہی تھی جسے ہندو اور سکھ وغیرہ بھی سیکھتے پڑھتے تھے۔

مکرر عرض کر دوں کہ ناک کی سیدھ میں دونوں ابروؤں کے درمیان اوپر کو سر کے بال نکلنے کی منتہا تک جو حصہ ہے صرف اسی کو پیشانی کہتے ہیں اس حصہ پیشانی کے دائیں اور بائیں کی دونوں جانبوں کو جبین کہتے ہیں اور اس جبین ہی کو بعض حضرات دو جبینیں کہتے ہیں جیساکہ عربی لغت کے امام علامہ ابن منظورؒ[1] فرماتے ہیں۔

والجبین: فوق الصُّدغ وهما جبینان۔ عن یمین الجبهه و شمالها۔

ابن سیده: والجبینان حرفان مكتنفان الجبهة من جانبیها فیما بین الحاجبین مصعدًا الی قصاص الشعر[2]۔

ملحوظہ: (نوٹ) تجربہ کرکے دیکھ لیجئے کہ پیشانی کی مذکورہ نشاندہی کے مطابق جو چھوٹی سی جگہ ہے اس سے پسینا نہیں آتا بلکہ متعینہ پیشانی کے دائیں بائیں جو جبین کا حصہ ہے اسی سے پسینا آتا ہے جو بوقت وفور آنکھوں میں پڑتا ہے اسی لیے حدیث میں جہاں پسینے کا ذکر آیا ہے وہاں لفظ جبین ہی کا استعمال ہوا ہے۔ اگر پیشانی سے پسینا پھوٹتا ہوتا پھر آنکھوں میں پڑنے کے بجائے ناک پر سے بہتا۔ ہاں پسینے کی کثرت سے پیشانی بھی متاثر ہو جاتی ہے اوپر کے اقتباسات سے یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ پیشانی کی جگہ تنگ ہے اور جبین اس کی نسبت وسیع ہے۔ محترم مقالہ نگار الحق کے ص۵۱ پر رقمطراز ہیں کہ:۔

جبین سے متعلق صحابہ کرام نے آپ کے جو صفات بیان کئے ہیں ان میں سر دست میں تین کو ضبط تحریر میں لاتا ہوں۔ مغاض الجبین۔ صلت الجبین۔ واسع الجبین۔ ان تینوں کے معنی ہیں کشادہ پیشانی والا نہ کہ کشادہ کروٹوں والا۔ بلفظہٖ من شاء فلینظر فیها۔

قارئین کرام! لفظ جبین کی جگہ اگر جبہہ کا لفظ ہوتا تو پھر پروفیسر صاحب کی دلیل بنتی ہے لیکن یہاں تو

---

[1] ولد ۶۳۰ھ توفی ۷۱۱ھ [2] القصاص بتثلیث القاف۔ بال نکلنے کی منتہا۔

جبین کی وسعت کی طرف اشارہ ہے نہ کہ جبہہ یعنی پیشانی کی وسعت کی طرف ۔ جیسا کہ اوپر مضیق جبہہ اور وسعت جبین ثابت کر دی گئی ہے ۔

اب یہ بات توضیح سے ثابت ہو گئی ہے کہ جبہہ یعنی پیشانی کا پھیلاؤ دو ابروؤں کے درمیان سے لے کر اوپر سر کے بال نکلنے کی منتہا تک ہی ہے اور اس کے دائیں بائیں دونوں کانوں تک جبین ہے ۔ فافهموا وتدبروا وتفکروا ۔

یہاں یہ بات ذہن نشین کر لیجئے کہ تغیرّ زمان ولسان کے عام حوادث کے تحت کچھ لفظ عوام وخواص میں زبان زد ہو جاتے ہیں جو اصل لغت اور اس کے قواعد وضوابط کی رو سے غلط ہوتے ہیں ۔ غَلَطُ الْعَوَام فَصِيحٌ کا اصول مسلمانوں کی کسی زبان پر صادق نہیں آسکتا ۔ هذا ما عندی والعلم عند الله ۔

یہ بھی ذہن میں مستحضر رہے کہ کان سے وسطِ راس یعنی وسطِ سر تک دونوں طرف صدغ ہے ۔

حضرات قارئین کرام ! اوپر آپ عربی کے معتبر لغت ، المحکم اور لسان العرب کے حوالہ سے پڑھ آئے ہیں کہ والجبهه موضع السجود یعنی پیشانی سجدہ کی جگہ کو کہتے ہیں ساتھ ہی اُردو کے شاعر نے یہ کہہ کر اس کی تصدیق کر دی ہے کہ ابرو پیشانی میں داخل نہیں ہے ؎

یار کی پیشانی پُر نور سے کیا دوں مثال
جبہہ خورشید بے ابرو نظر آیا مجھے

اس کا آپ تجربہ کر کے یوں بھی معلوم کر سکتے ہیں کہ بعض نمازی سجدہ کرتے وقت اپنی پیشانی کو زمین پر رکھتے وقت سر کو زور سے دبلتے ہیں اس لیے ان کے ماتھے پر پیشانی کی جگہ پر سجدہ کا نشان پڑ جاتا ہے یہ نشان آپ کسی نمازی کی پیشانی پر ملاحظہ فرما کر یقین کر لیجئے کہ پیشانی صرف وہی ہے جہاں سجدہ کا نشان پڑا ہوا ہے والجبهة موضع السجود ۔ بھی پیش نظر رہے ۔

انظر ، لسان العرب ۔ والسلام مع الاکرام

Islamabad

(مولانا سید) محمد رابع حسنی ندوی (انڈیا)

بابری مسجد کے انہدام کے بعد ملک کے مختلف حصوں میں جو ہولناک فسادات بلکہ جان ومال کی سفاکانہ تباہی جس طرح ہوئی اس نے اقلیت کے دلوں میں بدامنی و بے اعتباری کے غیر معمولی احساسات پیدا کر دیئے مسلمانوں کو بابری مسجد کے انہدام پر بہت رنج وصدمہ پہنچا تھا وہ اس بات کے متوقع تھے کہ ان کے زخم دل پر کچھ مرہم رکھا جاتا لیکن فسادات نے اور ان فسادات میں ایک طرفہ مسلمانوں پر مصیبت کے ٹوٹ پڑنے نے اور پھر اس کے بلا کسی خاصی روک ٹوک کے کئی کئی روز تک وحشیانہ طریقہ سے جاری رہنے نے ملک کے انتظامیہ کے متعلق ان کو بہت مایوس کیا اور دنیا کی نظر میں بھی انتظامیہ کا کردار بہت مجروح ہوا انتظامیہ اگرچہ زبان سے زیادہ سے زیادہ ہمدردی ظاہر کرتا رہا لیکن طریقۂ کار بہت ہی مایوس کن ثابت ہوا۔

آج ہندوستانی مسلمان یہ سمجھنا چاہتا ہے کہ مرکزی حکومت کے وعدوں اور عمل کے درمیان اتنا فاصلہ کیوں ہے حکومت کوئی بھی ہو اگر ذمہ دارانہ اور سنجیدہ طریقہ اختیار کرے تو لاقانونیت کو روک سکتی ہے اس کو کسی بھی سازشی عمل کی اطلاع پہلے سے مل جاتی ہے اس کے امن و امان کے ذرائع اس بات سے باخبر رہتے ہیں کہ ان کے حلقوں میں کون لوگ سازشی ارادہ رکھتے ہیں لہٰذا وہ سازش کو عمل میں آنے سے قبل اور زیادہ سے زیادہ عمل شروع ہوتے ہی اس کے ذمہ داروں کو سختی سے روک سکتے ہیں اور ان کے رد کے جانے پر پورا سازشی عمل رک سکتا ہے بابری مسجد کا انہدام ہو یا بمبئی کا فساد، دونوں میں سے ہر جگہ اس کی قیادت اور رہنمائی کرنے والے حکومت سے باہر نہ تھے اور فساد جاری رہنے کے بعد بھی اس کی آگ کو ایندھن دینے والے حکومت کے علم میں آتے رہے لیکن آگ میں ایندھن ڈالنے سے روکنے کے بجائے آگ کو کم کرنے کے عزائم کا اعلان کرتے رہنے سے آگ نہیں رکتی۔

بمبئی کی تباہی کسی ایک یا دو فرقوں کی تباہی نہیں، بمبئی شہر ہندوستان کا اقتصادی دارالصنعت کی حیثیت رکھتا ہے اس کے آدمیوں، عمارتوں، فرموں، کارخانوں اور دکانوں کی تباہی ملک کے اقتصادی ڈھانچہ

کی بھی تباہی ہے جس کا نقصان ملک کو کئی دہائیوں تک جھیلنا پڑے گا۔ اجودھیا کا واقعہ پھر بمبئی اور احمد آباد کی تباہی کا واقعہ انتظامیہ کی بے تدبیری اور لاپرواہی کی ایسی مثال ہے جو اس کے ذمہ داروں کے تعلق سے عرصہ تک یاد رکھی جائے گی اور ان کی شہرت کو برابر داغدار رکھے گی یہ انتظامیہ ایک طرف تو عدالتی تاکیدوں اور احکامات کی عزت بچا نہ سکی اور دوسری طرف انسانی خون کی ہولی اور زبردست کاروباری مرکزوں کی کاروباری تباہی کو ایک ہفتہ تک کنٹرول کرنے سے عاجز رہی اس کا اثر یہ پڑا کہ ملک کی فرقہ وارانہ فضا کی ابتری میں کمی تو کیا ہوتی وہ اور بڑھ گئی اور ابھی جلد کم ہونے کا امکان بھی کم ہے کیونکہ جو لوگ اس فضا کو برابر خراب کر رہے ہیں ان کے بیانات اور طرز عمل کو بھی اہل اقتدار کی طرف سے تھامنے کی سنجیدہ کوشش نہیں ہو رہی ہے۔

مسلمانوں کی تعداد اس ملک میں اتنی کم نہیں ہے کہ وہ ایسی کوششوں سے فنا کر دیئے جائیں فسادات سے صرف یہ ہوگا کہ جانی و مالی تباہی کا سلسلہ چلے گا پھر تھک کر یا ظلم و زیادتی کی کثرت سے شرما کر لوگ بتدریج تھم جائیں گے لیکن کئی دہائیوں تک وہ کئی طرح کی تباہی کے نتائج بھگتیں گے لیکن کوئی ایک فریق دوسرے فریق کو ختم کرنے کی تمنا پوری نہ کر سکے گا۔

عدم تشدد، رحم دلی، انسانی ہمدردی کی دعوت یا ارادے کے لیے جو عملی فکرمندی بلکہ ایثار و قربانی کی ضرورت ہے اس کے بغیر ہندوستان کے جمہوریت اور عدم تشدد کے دعوے صدا بصحرا سے زیادہ ثابت نہ ہو سکیں گے اور ہندوستان اپنے قائدین آزادی کی جن تمناؤں کے ساتھ آزاد ہوا وہ تمنائیں کامیاب نہ ہو سکیں گی۔ یہ تو ہوا وہ پہلو جس کا تعلق اکثریت اور انتظامیہ کے افراد سے ہے اور جن کا نقصان ملک کی اقتصادی حالت کو نقصان پہنچنے اور ملک کی انسانی و تاریخی شہرت کے ضائع ہونے سے ہے جس کی فکر حکومت کے ذمہ داروں اور اکثریت کے رہبروں کے کرنے کی زیادہ ہے۔

رہا اقلیت کا معاملہ تو ایک تو ملک کے ساتھ تعلق کے ناطے اس کو اکثریت کے شانہ بہ شانہ فکر کرنا تھا جو انصاف ملنے کی صورت میں خوش دلی کے ساتھ ہوتا اور انصاف نہ ملنے کی صورت میں اس ذمہ داری کی ادائیگی مجروح رہے گی۔

دوسرے اس سنگین حادثہ کی وجہ سے اور اس سے پیدا ہونے والی ہلاکت خیزی کے حال میں اقلیت کے لیے صبر و برداشت کا امتحان ہے لیکن مسلمان ہونے کی وجہ سے اپنے تاثر و ناراضی کے اظہار میں اور واقعہ کے ردعمل میں اللہ و رسولؐ کے دکھائے ہوئے راستہ سے ہٹنا نہیں ہے اسی میں مسلمان کے لیے کامیابی کی ضمانت ہے مسلمان کا کام اللہ کی نصرت سے بنتا ہے اور یہ نصرت اللہ کو راضی رکھنے پر آتی ہے۔

ہم کو اولاً اپنی اخلاقی زندگی اور کارکردگی کا جائزہ لینا چاہیئے کہ ہماری کتنی جد و جہد اخلاص اور سنجیدہ

حکمت عملی کی رہی اور کتنی محض دعووں نعرے دینے کی رہی ہے ہمارے کردار کا کیا حال ہو رہا ہے، کیا ہمارا مسجد سے تعلق ویسا ہی ہے جیسا ہونا چاہیئے۔ بحیثیت مسلمان کے ہمارا فرض ہے کہ ہم جب حق تلفی یا زیادتی سے متاثر ہوں تو ایسوں سے انتقام ہرگز نہ لیں جو بے گناہ افراد میں سے ہیں۔ ہم غصہ سے ایسے بے خود نہ ہو جائیں کہ ہمارے عمل سے ردعمل کی کوئی نامناسب شکل پیدا ہو جائے۔

بابری مسجد کے انہدام کے اصل مجرم وہ دہشت گرد افراد ہیں جو ہندو فرقہ پرست اور عسکریت نواز جماعتوں سے تعلق رکھتے ہیں پھر ان کو روکنے اور ان کی تخریبی کوششوں پر روک لگانے اور ان کو دبانے میں کوتاہی کرنے والا انتظامیہ ہے ہم کو اپنی ناگواری کے اظہار کو انہیں کے دائرے میں محدود رکھنا چاہیئے اور یہ اظہار بھی پر عزم طریقے سے لیکن عاقلانہ اور دانشمندانہ ہونا چاہیئے ورنہ سوائے صرف بُرا بھلا کہنے اور سہتے رہنے کے ہمارے کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔

بابری مسجد کے انہدام کے سلسلے میں جو ہوا وہ دستور کی بھی خلاف ورزی تھی اور حکومتوں کی یقین دہانیوں کی بھی خلاف ورزی تھی، اسی طرح مسلمانوں کے مقدمہ کو مضبوطی ملی۔ یہ مقدمہ عدالت کے ذریعہ اور حکومت کے ذرائع سے ہمدردی حاصل کر کے جیتنا ناممکن نہیں اکثریت کے صلح اور جو انصاف پسند افراد کو بھی ساتھ لیا جا سکتا ہے، اس طرح متعصب اور دہشت پسند گروہ الگ تھلگ کیا جا سکتا ہے، حکمت و دانائی کے لحاظ سے یہ طریقہ زیادہ مفید ہے، گرم اور جذباتی طریقہ سے متعصب اور دہشت گرد فریق کے لیے اپنے ہم مذہب ہندو اکثریت اور انتظامیہ کے افراد کو اپنا ہمدرد بنا لینا آسان ہو جائے گا، پھر کچھ ایسی افسوسناک شکل بنے گی کہ ایک طرف فریق مسلمان اقلیت ہے اور دوسری طرف ملک کی اکثریت کے غالب افراد اور انتظامیہ کے غالب افراد جمع ہو گئے ہیں مسلمانوں نے اپنے جوش اور گرمی میں اپنے مخالف فریق کے ساتھ دو مزید طاقتوں کو شریک بنا لیا ہے۔ یہ حکمت و تدبیر کے بالکل خلاف ہے نرم طریقہ کار اور حسن تدبر سے اکثریت کی خاصی تعداد کی ہمدردیاں حاصل کرنا زیادہ مشکل نہ تھا پھر ایسا طریقہ کار جس سے انتظامیہ اور حکومت سے بھی صف آرائی ہو جائے دشمنوں میں اضافہ کرنے کے مترادف تھا اب بھی یہ گنجائش باقی ہے کہ مسلمان اپنے اس مقدمہ میں جو دستور و عام جمہوری اصولوں کے لحاظ سے صحیح ہے اکثریت کے بہت سے انصاف پسندوں کا تعاون لے سکتے ہیں اور انتظامیہ کے بھی بہت سے افراد کی ہمدردیاں حاصل کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں ایسی صورت میں دیر سویر کامیابی ناممکن نہیں ہے۔

مسلمانوں کے دین و دنیا دونوں اعتبار سے یہ واقعہ کتنا ہی سنگین ہو لیکن مسلمان جس تاریخ کے وارث ہیں اس میں ایسے دھکے پہنچے ہیں، لیکن جب اخلاص اور ہمت اور اسکے ساتھ صحیح حکمت عملی اختیار کی گئی تو نہ صرف یہ کہ حادثات کا مداوا ہوا ہے بلکہ مزید کامیابیاں حاصل ہوئیں لیکن یہ صبر، اتحاد اور مخلص رہبر کی بات مانتے ہوئے اپنی مرضی احکام الٰہی کے تابع کرنے سے ہوئی۔

ٹینڈر نوٹس

محکمہ مواصلات و تعمیرات کے منظور شدہ ٹھیکیداروں جنہوں نے سال رواں کے لیے رجسٹریشن کرائی ہو۔ مندرجہ ذیل کاموں کے لیے ٹینڈر مطلوب ہیں۔ ٹینڈر فارم کے لیے درخواست بمعہ کال ڈیپازٹ فیس اصلی کاپی رجسٹریشن و رسید فیس برائے ۹۳-۹۲ ، مورخہ ۹۳-۱-۹ تک کسی دن بھی پیش کرکے ٹینڈر فارم حاصل کئے جاسکتے ہیں جبکہ ٹینڈر مورخہ ۹۳-۱-۱۱ کو دوپہر بارہ بجے موجود ٹھیکیداروں کی موجودگی میں کھولے جائیں گے۔ ریٹ بھرنے کے بعد ٹینڈر فارم کی فوٹو کاپی جناب چیف انجینئر صاحب کو ارسال کرنا ہوگی۔ دیگر شرائط حسب قواعد و ضوابط بدستور رہیں گی۔

نمبر شمار	کاموں کی تفصیل	تخمینہ لاگت	زرِ ضمانت کال ڈیپازٹ	مدت تکمیل
I	ضلع پشاور میں مندرجہ ذیل مڈل / ہائی سکولوں میں سولہ کمروں کی تعمیر			
i	دو کمرے فی سکول:۔ مڈل سکول بھانہ ماڑی گنج گیٹ، ہائی سکول بچہ غلام ، گرلز مڈل شیخ آباد ، گلشن رحمان ، جھگڑہ ،	۳,۲۰,۰۰۰/- فی سکول	۶۴۰۰/- فی سکول	چھ ماہ
ii	ایک کمرہ فی سکول :۔ مڈل سکول پلوسی سفید ڈھیری ، تنی اور اضاخیل	۱۶۰,۰۰۰/- فی سکول	۳۲۰۰/- فی سکول	چار ماہ

نوٹ : سائٹ میں تبدیلی متعلقہ ایم پی اے صاحب کی مرضی کے مطابق ممکن ہوگی۔

ایگزیکٹو انجینئر ، بلڈنگ ڈویژن پشاور

NF (P) 2815

استعماری ہندوستان میں یاغستانی جہاد تاریخی تناظر میں

(۱۸۳۱ء تا ۱۹۴۷ء)

ماضی قریب کی تاریخ میں برصغیر ہندوستان کے افغانستان کے ساتھ ملحقہ مغربی خطہ (یاغستان) کے باشندوں کو اسلام کے ساتھ جذباتی لگاؤ اور حریت پسندی کی خصوصیات کی وجہ سے امتیازی حیثیت حاصل رہی ہے - چنانچہ ۱۸ ویں اور ۱۹ ویں صدی عیسوی میں ہندوستان میں مسلمانوں کے سیاسی زوال اور فرنگی استعمار کے تسلط کے زمانے میں برصغیر کی دیگر اقوام مسلمانوں کے تحفظ اور استخلاص وطن کے سلسلے میں ان سے ایک اہم کردار ادا کرنے کی توقع رکھتے تھے - اس سلسلے میں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ۱۸ ویں صدی کے ہندوستان کے نامور ماہر عمرانیات اور سیاسی مفکر شاہ ولی اللہ دہلوی (۱۷۰۳ء تا ۱۷۶۳ء) کے فرزند شاہ عبد العزیز دہلوی (۱۷۴۵ء تا ۱۸۲۳ء) کے بارے میں یہ متفقہ روایت ہے کہ امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خواب میں ان کو پشتو زبان سیکھنے کی طرف اشارتاً متوجہ فرمایا تھا - اس کی مصلحت یہی بیان کی جاتی ہے کہ اس دور میں پشتو بولنے یا سمجھنے والی اقوام سے ہندوستان کی آزادی اور وہاں کے مسلمانوں کے لئے ایک باعزت مقام کے حصول کے سلسلے میں بھرپور جد و جہد کی توقعات وابستہ تھیں - اس کی وجہ یہ تھی کہ اس زمانہ میں ہندوستان کی مسلمان اقوام میں سے ان لوگوں میں زیادہ بہتر حربی صلاحیت موجود تھی اور وہ مردانگی اور شجاعت کی صفات سے متصف تھے - واضح رہے کہ شاہ عبد العزیز ہی وہ شخصیت ہیں جنہوں نے ۱۸۰۳ء میں دہلی پر انگریزوں کے تسلط پر سب سے پہلے ہندوستان کے دار الحرب ہونے کا فتوی دیا تھا - اس فتوی کو ۱۹ ویں صدی کے دوران ہندوستانی تاریخ میں فرنگی اقتدار کے خلاف چلائی جانے والی انقلابی اور مزاحمتی تحریکوں کے لئے خشت اول کی حیثیت حاصل ہے - شاہ عبد العزیز کی انقلابی تعلیمات کے زیراثر عملی طور پر جہادی فعالیت کا پہلا مظاہرہ ان کے افکار کے حاملین سید اسماعیل شہید اور سید احمد شہید بریلوی کی امارت تلے ہندوستان کے اس خطے کے صدر مقام پشاور میں ہوا جہاں انہوں نے مشرقی پنجاب اور ملحقہ علاقوں کے مسلمانوں کو سکھوں کے ظلم و جبر سے نجات دلانے کے لئے ہندوستان کے دور دراز علاقوں سے چل کر اور پرصعوبت راستوں پر سفر کرکے ۱۹ ویں صدی کی تیسری دھائی کے نصف آخر کے دوران قربانیوں کی ایک نئی تاریخ رقم کی اور سکھوں کی زبردست مزاحمت کرکے اس علاقے میں اپنی باقاعدہ آزاد اسلامی حکومت قائم کی - یہ جماعت خطے کے باشندوں کو آزادی کا بنیادی پیدائش حق دلانے کی جد و جہد کے دوران ہزارہ کے علاقے میں ۱۸۳۱ مین سکھ فوجوں کا مقابلہ کرتے ہوئے بالاخر اپنی اجتماعی قوت کھو بیٹھی اور سید احمد بریلوی اور سید اسماعیل نے اپنے بیشمار ساتھیوں سمیت بالاکوٹ کے میدان میں اپنی جانیں جان آفریں کے سپرد کردیں - جہاد بالاکوٹ کی بظاہر ناکامی کے بعد مجاہدین کی ایک

پر عزم جماعت نے مولوی نصیر الدین دہلوی مولانا ولایت علی اور مولانا عنایت علی کی قیادت میں شمال مغربی سنگلاخ پہاڑی علاقوں میں سکھوں اور انگریزوں کے خلاف ایک طویل اور صبر آزما عسکری جد و جہد جاری رکھی اور بالآخر اس گروہ کے بقیہ مجاہدین نے ۲۰ ویں صدی کے اوائل میں افغانستان کی سرحدات کے ساتھ متصل بونیر اور باجوڑ کے یا غستانی علاقوں میں سمست اور چمرکنڈ کے مقامات پر اپنے مراکز قائم کرلئے اور استخلاص وطن کے لئے برطانوی سامراج کے خلاف مسلح مزاحمت کا سلسلہ جاری رکھا ۔ ان پاکستانی مجاہدین کی فہرست میں مولانا عبد الکریم (متوفی ۱۱ فروری ۱۹۱۵ء) مولانا عبد الکریم چمر کنڈی (متوفی ۱۹۲۱ء) مولانا محمد بشیر (اصلی نام عبد الرحیم ' متوفی رمضان المبارک ۱۹۳۴ء) اور مولوی فضل الٰہی وزیر آبادی (متوفی ۵ مئی ۱۹۵۱ء) کے نام خاص طور پر تاریخ کے سینے پر نقش ہیں ان مجاہدین کی عسکری سرگرمیاں محض بونیر اور باجوڑ کے پاکستانی علاقوں تک محدود نہیں تھیں بلکہ ان کے ساتھی ایک مربوط سلسلے کے تحت تھاکوٹ والائی (ہزارہ) تیواہ (خیبر) اور تکین اور وانہ (وزیرستان) کے علاقوں میں بھی انگریزی حکومت کے بر خلاف کاروائیوں میں مصروف تھے ان مجاہدین میں عبد الحکیم (بنگالی) احمد آفندی ۔ خود بے اور محمد عابد عباس عابدین (ترک) اور مولوی محمد حسن بی اے کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔ پاکستانی مسلح مزاحمت کے ان مراکز کا انتظام و انصرام ہندوستان کے دیگر علاقوں سے یہاں آئے ہوئے مجاہدین کے ہاتھ میں تھا جن کے ساتھ علاقے کے قبائلی باشندے معاونین کی حیثیت سے شامل تھے لیکن اس دوران کچھ ایسے مقامی (INDIGENOUS) افراد بھی سامنے آئے جن کی اس خطے میں مزاحمتی فعالیت نے فرنگیوں کا سکون چھین لیا ان میں مولانا عبد الغفور (سوات) بابا جی متوفی ۲۲ جنوری ۱۸۷۷ء مولوی نجم الدین (ہڈہ ملا صاحب متوفی ۲۲ رمضان ۱۹۰۲ء) ملامستان (سرتور فقیر دیوانہ ملا ۔ متوفی ۱۹۱۷ء) مولوی امیر محمد (چکنور ملا جہادی عملیات ! ۱۸۹۴ء ۔ ۱۹۳۱ء) مولوی محی الدین (ملا پاوند جہادی عملیات ! ۱۸۹۲ء ۔ ۱۹۱۳ء مولوی احمد جان (سنڈاکئی ملا صاحب جہادی عملیات ۱۹۰۲ء ۔ ۱۹۲۷ء) مولوی سید امیر جان (بابڑے ملا صاحب متوفی ۲۸ رمضان ۱۹۲۱ء) مولوی سید اکبر (آفریدی ملا جہادی فعالیت ۔ ۱۸۹۲ء) حاجی فضل واحد (ترنگزئی حاجی صاحب ' متوفی ۱۴ دسمبر ۱۹۳۷ء) مولوی حافظ احمد خان کاگ پاؤ ملا متوفی ۱۹۲۷ء سید محمد جلال (سرتور فقیر ر فقیر صاحب النو ر علینگار ' مزاحمتی عملیات : ۱۹۲۵ء (۱۹۳۵ء) اور ملتان آفریدی (مزاحمتی عملیات : ۱۹۰۵ء ۔ ۱۹۰۸ء) بطور خاص شامل ہیں ان یا غستانی مجاہدین کی سرگرمیوں کو ہندوستان کے دیگر قومی سیاسی رہنماؤں مثلا مولانا ابوالکلام آزاد ' مولانا ظفر علی خان ' مولانا شوکت علی ' مولانا عبد الباری فرنگی محلی ' حکیم اجمل خان اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی مکمل حمایت حاصل تھی یہ قومی زعما خفیہ طریقے سے یا غستانی کاروائیوں کے لئے رقوم اور سامان حرب و ضرب کی مہم رسانی کا انتظام کرتے یہ بات تاہم بہت کم

لوگوں کو معلوم ہے کہ تبلیغی جماعت کے بانی مولانا محمد الیاس بھی ان مجاہدین کے معاونین میں شامل تھے
۔

استعماری دور کے ھندوستان کی ایک اور اہم شخصیت مولانا محمود حسن (۱۹۲۰ء - ۱۸۵۱ء) کا کردار بھی یا غستانی جہاد کے حوالے سے ناقابل فراموش ہے مولانا محمود حسن نے ۱۸۷۳ء میں درا العلوم دیوبند سے فراغت کی سند حاصل کی آپ دار العلوم کے اولین فارغ التحصیل گردانے جاتے ہیں ۔ ۱۸۷۴ء کے دوران آپ نے دار العلوم میں بطور مدرس ذمہ داریاں سنبھالیں اور آزادی کی جد و جہد میں اپنی بھرپور فعالیت شروع کی ۔ آپ اپنے دور میں شاہ عبد العزیز دہلوی مرحوم کے انقلاب اور استعمار دشمن فکر کے حامل تھے اس فکر کی تعلیم آپ نے اپنے اساتذہ بالخصوص مولانا محمد قاسم نانوتوی (متوفی ۱۸۷۹ء) مولانا محمد یعقوب (متوفی ۱۸۷۴ء) اور مولانا رشید احمد گنگوہی (متوفی ۱۹۰۵ء) سے حاصل کی تھی یہ حضرات مولانا مملوک علی (متوفی ۱۸۵۰ء) کے شاگرد تھے جس کا فکری سلسلہ براہ راست شاہ عبد العزیز کے ہم عصر اور تربیت یافتہ مولانا رشید الدین دہلوی کے ساتھ ملتاتھا ۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی ان اھل علم کے گروہ میں شامل تھے جنہوں نے مولانا امداد اللہ مہاجر مکی (متوفی ۱۸۹۹ء) اور کچھ دیگر علماء کے ساتھ مل کر فرنگی تغلب کے خلاف قومی حریت کی ۱۸۵۷ء کی عظیم مقاومت کے دوران ضلع مظفرنگر کے شاہی نامی مقام پر اپنی آزاد حکومت قائم کی تھی ۔ انھیں حریت پسند علماء کی جماعت نے ۱۸۶۷ء میں سہارنپور کے قصبہ دیوبند میں دار العلوم کی بنیاد رکھی تھی ۔ اس دار العلوم کے مقاصد میں یہ بات شامل تھی کہ ایسے رجال کار تیار کئے جائیں جو مسلمانوں کے علمی ورثے کے تحفظ کے ساتھ ساتھ ھندوستان سے برطانوی سامراج کے انخلاء کی جد و جہد میں شامل ہوں ۔

مولانا محمود حسن نے دار العلوم کے طلبہ ، فضلاء اور متعلقین کو ثمرۃ التربیہ (۱۸۷۸ء) جمعیہ الانصار (۹ن۱۹۰ء) اور نظارۃ المعارف القرآنیہ (۱۹۱۳ء) جیسی تنظیموں میں منسلک کرکے ان کا ایک نظم قائم کرنے کی کوشش کی یہ تنظیمیں بظاہر غیر سیاسی اور محض تعلیمی دکھائی دیتی تھیں لیکن در اصل ان کے دور رس سیاسی اور انقلابی اہداف موجود تھے ۔ دیوبند میں ھندوستان کے ہر علاقے کے باشندے ول علم کی خاطر داخل ہوتے تھے اور ان میں افغانستان اور یاغستان کے طلبہ کی ایک کثیر تعداد بھی ، تھی مولانا محمود حسن کا یاغستانی مجاہدین بالخصوص ھڈے ملا صاحب ۔ سنڈاکئی ملا صاحب اور ئی حاجی صاحب کے ساتھ گہرا رابطہ تھا ۔ اس کے علاوہ آپ نے ۱۵ - ۱۹۱۴ء کے دوران اپنے کئی عتماد ساتھیوں جن میں مولانا سیف الرحمن ، مولانا فضل دین اور مولانا فضل محمد بطور خاص قابل ہیں کو سمست اور چرکنڈ کے یاغستانی مجاہدین کی کاروائیوں میں عملی شرکت کے لئے بھیجا تھا ۔ آپ ھی کی ہدایت پر مولانا صادق سندھی نے بلوچستان جاکر لسبیلہ کے مقام پر قبائل کی بغاوت بھڑکائی تھی ۔

اس بغاوت کے نتیجے میں جنگ عظیم اول کے دوران کوت العمارہ (عراق) کے محاذ پر اپریل ۱۹۱۶ء میں جنرل ٹاؤن سینڈ (TOWNSEND) کو عثمانی فوجوں کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے تھے کیونکہ کراچی سے برطانوی فوجی کمک کا رخ عراق کے بجائے بلوچستان کی طرف موڑنا پڑا جس کی وجہ سے جنرل ۔ یار و مددگار رہا ۔ پہلی عالمی جنگ کے دوران یہ ایک بڑا اہم واقعہ تھا ۔ یاغستانی تحریک مقاومت پورے جوش و جذبے کے ساتھ جاری رہی ۔ لیکن اس دور میں برطانیہ جیسی بڑی طاقت کے خلاف کافی رسد ' جدید جنگی ساز و سامان اور مناسب بیرونی فوجی و مالی تعاون کے بغیر بھرپور مزاحمت کا جاری رکھنا آسان کام نہ تھا ۔ مولانا محمود حسن کو صورت حال کی سنگینی کا بخوبی احساس تھا ۔ اس دوران ۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم اول بھی چھڑ گئی تھی اور مولانا اور آپ کے ہم فکر ساتھیوں کو یہ امید پیدا ہوگئی تھی کہ اس جنگ کے نتیجے میں بالاخر برطانوی سلطنت کی نوآبادیاتی گرفت کمزور پڑ جائے گی اور ھندوستان کی آزادی کی راہیں کھل جائیں گی چنانچہ یاغستانی حریت پسندوں کی اس مشکل کو حل کرنے کے لئے آپ نے اپنے ایک قریب ترین ساتھی مولانا عبید اللہ سندھی (۱۸۷۲ء تا ۱۹۴۴ء) کو ۱۹۱۵ء میں پاکستانی جہاد کے لئے افغانستان کی حکومت کے تعاون کے حصول کی خاطر کابل بھیجا جبکہ آپ خود اس سال کے اواخر میں حجاز تشریف لے گئے تاکہ عثمانی خلافت کے عمال کو بھی ھندوستان کی صورت حال سے آگاہ کرکے ان سے بدیس استعمار کے خلاف آزادی ھند کی جد و جہد میں مدد حاصل کرلی جائے ۔ حجاز پہنچنے پر آپ نے وہاں کے عثمانی گورنر غالب پاشا ' عثمانی وزیر جنگ انور پاشا اور فلسطینی محاذ جنگ کے کمانڈر جمال پاشا کے ساتھ تفصیلی ملاقاتیں کیں اور ان کو ھندوستان کی صورت حال سے آگاہ کیا ۔ انہوں نے آپ کو عثمانی خلافت کی طرف سے فرنگی حکومت کے خلاف ہر قسم کے تعاون کا یقین دلایا ۔ غالب پاشا نے تو اس سلسلے میں آپ کو حوصلہ افزا کلمات پر مشتمل ایک خصوصی تحریر بھی دی جو غالب نامہ کے نام سے مشہور ہوئی ۔ مولانا محمود حسن کی ہدایت پر ان کے ایک خصوصی معاون مولانا منصور انصاری (اصل نام : محمد میاں) نے خفیہ طریقے سے اس خط کی نقول یاغستانی مجاہدین کے درمیان تقسیم کرنے کا مربوط انتظام کیا جس سے ان مجاہدین کے حوصلے انتہائی بلند ہوئے اور انہوں نے حصول حریت کے لئے اپنی کوشش تیز تر کردیں ۔ عثمانی حمایت کے اثرات یاغستان علاقوں کے علاوہ میدانی علاقوں پر بھی پڑے اور وزیرستان کے قریب واقع موجودہ ضلع لکی مروت (بنوں ڈویژن) میں سید احمد (بیوے فقیر وفات ۱۹۲۶ء سے قبل پشاور جیل میں) اور محمد اکرم خان (متوفی ۱۹۳۴ء) کی قیادت میں تقریبا ڈیڑھ سو مسلح افراد کی جماعت نے مارچ ۱۹۱۶ء میں لوگوں کو برطانوی حکومت کے خلاف عثمانی فوج کی آمد پر مسلح جنگ شروع کرنے کی اپیل کی اس جتھے کے سرکردہ افراد کو ۲۲ر مارچ ۱۹۱۶ء کو گرفتار کرلیا گیا اور اس وقت کے ڈپٹی کمشنر بنوں فتو پٹرک (FITZ PATRICK) نے ایک ہفتے کی سرسری سماعت کے بعد ۱۸

اپریل ۱۹۱۶ء کو محمد اکرم خان کی تمام منقولہ اور غیر منقولہ جائداد بحق سرکار ضبط کرنے کا حکم دیا اور اسے جزائر انڈمان (کالاپانی) بھیجا جبکہ سید احمد (بیرے فقیر) کو پشاور جیل میں قید کرلیا گیا محمد اکرم خان کو ۱۹۲۶ء میں کالاپانی سے رہائی ملی - ادھر کابل میں مولانا عبید اللہ سندھی کو انتہائی پیچیدہ صورت حال کا سامنا تھا - کابل کے امیر حبیب اللہ خان (۱۹۰۱ء - ۱۹۱۹ء) ہندوستان کے آزادی خواہوں کی خاطر فرنگی کو ناراض کرنے کے لئے تیار نہیں تھے اس لئے وہ اس جد و جہد کے معاملے میں زیادہ گرمجوشی کا اظہار کرنے سے پہلو تہی کی پالیسی پر گامزن تھے - لیکن مولانا سندھی دسمبر ۱۹۱۵ء میں کابل میں موجود بعض دوسرے ہندوستانی انقلابیوں کے ساتھ مل کر ہندوستان کی ایک قومی مؤقت حکومت کی تشکیل کرنے میں کامیاب ہوگئے جس کی صدارت کا منصب راجہ پرتاب اور وزارت عظمی کا منصب مولانا برکت اللہ بھوپالی کے سپرد کردیا گیا جبکہ مولانا سندھی اس کے وزیر داخلہ بنے - اس قسم کی حکومت کی تشکیل ایک بین الاقوامی قانونی ضرورت تھی تاکہ دنیا کی دوسری قوموں کے ساتھ باضابطہ طور پر ہندوستان کی آزادی کی جد و جہد کے حوالے سے مذاکرات اور معاہدے کئے جاسکیں - چنانچہ اس مقصد کے لئے قومی حکومت موقتہ کی طرف سے مارچ اور اپریل ۱۹۱۶ء کے دوران روس ' جاپان اور استنبول کو سفارتی مشن بھیجے گئے مولانا سندھی نے کابل میں جنود اللہ کے نام سے ایک نیم فوجی تنظیم کا ابتدائی خاکہ بھی ترتیب دیا جس کے لئے مولانا محمود حسن کا نام سالار اعلی کے طور پر تجویز کیا گیا - ان سیاسی کوششوں کا مقصد یہ تھا کہ بین الاقوامی فوجی اور سیاسی تعاون کے ذریعے ہندوستان سے نو آبادیاتی نظام کے الغاء کی جد و جہد میں یاغستانی مجاہدین کو تقویت کا سامنا فراہم کیا جائے -

مولانا سندھی نے کابل میں اپنی سرگرمیوں کے بارے میں مولانا محمود حسن کو آگاہ کرنے کی خاطر ان کی تفصیلات ایک ریشمی رومال پر کندہ کیں اور اپنے ایک ساتھی شیخ عبد الحق کو یہ ذمہ داری سونپی کہ وہ خفیہ طور پر یہ دستاویز حیدر آباد (سندھ) میں شیخ عبد الرحیم کے حوالے کردیں تاکہ وہ اس کو حجاز میں مولانا محمود حسن کو پہنچادیں - ریشمی رومال کے ساتھ مولانا محمود حسن کے نام ایک خط مولانا منصور انصاری (محمد میاں) کی طرف سے بھی تھا اس غیر معمولی دستاویزات پر ۸ ' ۹ رمضان ۱۳۳۴ھ ر ۸ ' ۹ جولائی ۱۹۱۶ء کی تاریخیں درج تھیں شیخ عبد الحق نے حیدر آباد جانے کے لئے ۱۵ ر اگست ۱۹۱۶ء کو ملتان میں رب نواز نامی ایک شخص کے ہاں رات کو قیام کیا - جس کے ساتھ شیخ عبد الحق کی سابقہ شناسائی تھی - رب نواز کو کسی نہ کسی طرح ان خفیہ تحریرات کا علم ہوا جو اس نے شیخ عبد الحق سے حاصل کرکے پنجاب کے برطانوی لفٹیننٹ جنرل سرمائیکل اوڈائر (SIR MICHSWLO' DWVER) کے حوالے کردیں - اس طرح آزادی ہند کی ایک عظیم جد و جہد اپنا مطلوبہ ہدف حاصل کرنے سے پہلے طشت ازبام ہوکر ناکام ہوگئی - برطانوی حکومت کے دباؤ کے تحت مولانا سندھیؒ کو کابل میں اور

مولانا محمود حسن کو ان کے ساتھیوں مولانا حسین احمد مدنی ، مولانا عزیر گل ، مولانا وحید احمد اور مولانا حکیم نصرت حسین سمیت حجاز میں گرفتار کرلیا گیا ۔ حجاز میں اس وقت شریف مکہ کی حکومت قائم ہو چکی تھی جس نے عثمانی عمال کو وہاں سے بے دخل کردیا تھا مولانا محمود الحسن اور ان کے ساتھیوں پر مصر میں مقدمہ چلا جس کے مطابق ان کو فروری ۱۹۱۷ء میں جزیرہ مالٹا میں قید کرلیا گیا ۔ حالات کی یہ کروٹ یاغستانی جد و جہد حریت کے لئے ایک سخت دھچکے سے کم نہ تھی لیکن ان نامساعد حالات کے باوجود مجاہدین نے اپنے مزاحمتی سرگرمیاں منقطع نہیں کیں ۔

مولانا محمود الحسن اپنے ساتھیوں سمیت رہائی پاکر ۸ ر جون ۱۹۲۰ء کو ہندوستان پہنچے ۔ فروری ۱۹۱۹ ء میں امیر حبیب اللہ خان کے قتل کے بعد مولانا سندھی کو بھی رہائی ملی ۔ لیکن انہوں نے ہندوستان واپس آنے کی بجائے نومبر ۱۹۲۲ء میں کابل چھوڑ کر روس ۔ ترکی اور حجاز کی راہ لی اور مجموعی طور پر ۲۴سال کی غریب الوطنی کے بعد مارچ ۱۹۳۹ء میں واپس وطن لوٹے ۔ مولانا محمود حسن کی ہندوستان واپسی کے وقت ملکی اور بین الاقوامی حالات میں زبردست تبدیلیاں آئی تھیں ۔ برطانیہ جنگ عظیم اول میں جو نومبر ۱۹۱۸ء میں بند ہوگئی تھی فاتح فریق کی حیثیت سے سامنے آیا تھا اور اب وہ اور اس کے اتحادی جنگ میں اپنے مسلمان حریف عثمانی خلافت کو ختم کرنے کے منصوبوں پر عمل در آمد کے لئے مستعد تھے عثمانی خلافت کو اپنی بقا کا چیلنج در پیش تھا اس صورت حال کی وجہ سے ہندوستانی مسلمان شدید اضطراری کیفیت کا شکار تھے چنانچہ انہوں نے خلافت کے تحفظ کے لئے تحریک خلافت شروع کی جس میں بلا لحاظ مذہب دوسرے ابنائے وطن نے بھی مسلمانوں کی بھرپور حمایت کی ۔ ہندوستان میں فرنگی حکومت کے خلاف کسی بھی ممکنہ تحریک کا قلع قمع کرنے کے لئے مارچ ۱۹۱۹ء میں رولٹ ایکٹ کو قانونی شکل دے دی گئی تھی جس کے تحت ہندوستانیوں سے تمام بنیادی شہری حقوق چھین لئے گئے تھے اپریل ۱۹۱۹ء میں امرتسر میں جلیانوالہ باغ کا خونین واقعہ پیش آیا جہاں ظالمانہ فرنگی قوانین کے خلاف پر امن احتجاجی جلسے کے شرکاء کو جنرل ڈائر کے حکم سے بے تحاشا فائرنگ کا نشانہ بنایا گیا ۔

اس گھمبیر قومی اور بین الاقوامی صورت حال کی وجہ سے ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف ترک موالات اور عدم تعاون کی تحریکوں نے جنم لیا جوکہ حقیقی معنوں میں بھرپور کل ہند عوامی تحریکیں تھیں انہیں حالات کے دوران نومبر ۱۹۱۹ء میں جمعیت العلماء ہند تشکیل دے دی گئی یہ مولانا محمود حسن کے فکر کے خوشہ چین علماء پر مشتمل جماعت تھی ۔ مولانا محمود حسن اور آپ کے ساتھیوں نے اس نئی صورت حال کے پیش نظر آزادی ہند کے لئے مسلح تحریکات کی راہ ترک کر کے پر امن عوامی جد و جہد کا طریقہ اپنایا اور تحریک خلافت ، جمعیتہ العلماء ہند اور انڈین نیشنل کانگرس کے پلیٹ فارم سے ترک موالات اور عدم تعاون کی تحریکوں میں بھرپور طریقے سے فعال ہوئے یہ جمہوری طرز کی تحریکیں تھیں

جس میں ہندوستانیوں نے انگریزوں کے دئے ہوئے خطابات کی واپسی اور ان سے ہر قسم کے تعلقات کے انقطاع کے ذریعے عدم تشدد کے اصولوں کی اساس پر آزادی کا ہدف حاصل کرنا تھا اس ھنگامہ خیز دور میں مولانا محمود حسن کے کردار کی وجہ سے ان کو شیخ الہند کا لقب دے دیا گیا جو بعد میں ان کے اصل نام کا جزو لاینفک بن گیا۔

بیسویں صدی کی دوسری دھائی کے دوران ہندوستان میں عوامی سیاسی بیداری در اصل ۱۹ ویں صدی کی تیسری دھائی سے جاری یاغستانی جہاد کا نتیجہ تھا جس سے متاثر ہو کر ملک کے طول و عرض میں لوگوں نے برطانوی استعمار سے جمہوری اور آئینی طریقے سے نجات حاصل کرنے کی کوششیں شروع کیں۔

ریشمی رومال سازش کے نا کام ہونے کے باوجود یاغستانی علاقوں میں آزادی ھند کی خاطر گوریلا سرگرمیاں جاری رہیں اور فرنگی حکومت کے لئے مسلسل سردرد کا سامان پیدا کرتی رہیں اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ مارچ ۱۹۲۳ء کے دوران صرف وزیرستان کے محاذ پر جنگ کے لئے انگریزوں نے اصل اخراجات کی مد میں ۱۱ کروڑ روپے کے مزید اخراجات اور ۱۱ ہزار مزید سپاہیوں کی منظوری دی۔ ۱۹۲۵ء۔ ۱۹۲۶ء میں ھندوستانی نوآبادیاتی فوجوں کے جنگی اخراجات کا تخمینہ ۵۷ کروڑ روپے لگایا گیا تھا۔ مارچ ۱۹۲۵ء میں کوہ شوال پر رزمک کی طرح ایک چھاونی بنانے کی خاطر وہاں کے قبائل پر شدید گولہ باری کی گئی۔ یاغستان کے دوسرے علاقوں کی صورت حال بھی اس سے مختلف نہیں تھی۔

جنگ عظیم اول میں فتح یابی کے بعد برطانیہ نے افغانستان کے ساتھ ملحقہ سرحدی علاقوں کو مکمل طور پر زیر تسلط لانے اور یاغستانی مزاحمت کو شدت کے ساتھ کچلنے کی پالیسی اپنا لی جس میں اس کو بڑی حد تک کامیابی حاصل ہوئی اس مقصد کے لئے ترغیب و ترہیب کا ہر قابل تصور حربہ آزمایا گیا۔ چنانچہ ۱۹۳۹ء کے اواخر میں جب دوسری عالمی جنگ چھڑ گئی تو برطانیہ کے خلاف ان علاقوں میں مزاحمتی جد و جہد خاصی کمزور ہو چکی تھی تاہم انہی دنوں میں وزیرستان کے علاقے میں مولوی حاجی میرزا علی خان (فقیر ایپی ' ۱۸۹۷ء تا ۱۹۶۰ء) نے انگریزوں کے خلاف ایک طویل اور صبر آزما جد و جہد کی ابتداء کی اور برطانوی استعمار کی مزاحمت کا ایک نیا باب کھولا۔ آپ نے ۱۹۳۱ء۔ ۱۹۳۷ء کے دوران بلند و بالا وزیرستانی پہاڑوں کے نا قابل تسخیر غاروں میں اپنے مراکز قائم کرکے انگریزوں کے خلاف جارحانہ کاروائیاں شروع کی تھیں جو برصغیر سے فرنگی کے نکلنے تک جاری رہیں آپ کی عسکری جد و جہد در اصل اس یاغستانی تحریک کا تسلسل تھا جو ۱۹ ویں صدی کی تیسری دھائی کے دوران سرحدی علاقوں میں شروع کی گئی تھی آپ کی گوریلا سرگرمیوں کا تسلسل بین الاقوامی طور پر حوصلہ شکن حالات کے باوجود

منقطع نہیں ہوا یہ وہ دور تھا جب برطانیہ کے خلاف یا غستانی مزاحمت کی دیگر عسکری تحریکوں کا سابقہ دم خم باقی نہیں رہا تھا علاوہ ازیں جنگ عظیم دوم میں برطانیہ کی حریف طاقتیں (جرمن اور اٹلی) بھی فرنگی مخالف مزاحمتی احزاب کی مناسب مدد کرنے میں نا کام ہوگئی تھیں لیکن اس ناموافق عالمی صورت حال کے باوجود فقیر ا یپی نے برطانوی استعمار کے خلاف بھرپور مزاحمت کی - اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ فقیر ا یپی کے صرف ابتدائی حملوں میں تو سو کے لگ بھگ نو آبادیاتی فوجی افسر اور سپاہی قتل کردیئے گئے - انگریزوں نے فقیر صاحب کو گرفتار کرنے کی ہر ممکن کوشش کی اور ایک موقع پر تقریبا چار ہزار انگریز اور گورکھا سپاہیوں نے آپ کی کمین گاہوں پر اس دور کے جدید ترین جنگی سازو سامان کی مدد سے حملہ کیا لیکن وہ آپ کو گرفتار کرنے میں نا کام رہے - فقیر صاحب کی محض ابتدائی عسکری سرگرمیوں کے مقابلہ کرنے کے لئے انگریزی حکومت کے مصارف جنگ بارہ لاکھ پاونڈ تک پہنچ چکے تھے جو آج کل کے حساب سے تقریبا پچاس کروڑ روپے بنتے ہیں - ۱۹۳۸ء - ۱۹۳۹ء کے لئے فرنگی حکومت نے صرف وزیرستان کی جنگ کے لئے ایک کروڑ چھتر لاکھ روپے کا بجٹ منظور کیا تھا - فقیر ا یپی کے علاوہ وزیرستان کے محسود قبیلہ کے جنوبی علاقے میں ملا پاوندہ کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے شہزادہ فضل الدین (متوفی ۱۹۶۲ء) بھی انگریزوں کے خلاف گوریلا سرگرمیوں میں مصروف تھے اور انگریزوں کو ان کی طرف سے شدید مزاحمت کا سامنا تھا انگریزوں نے شہزادہ صاحب کی پہاڑی رہائش گاہ لنگہ پر شدید بمباریاں کیں - ان حضرات کے علاوہ وزیرستان کے بھٹنی قبیلہ سے تعلق رکھنے والے مولانا دین محمد (دین فقیر - متوفی ۱۲ ر دسمبر ۱۹۵۹ء) کا نام بھی یا غستانی مزاحمتی قائدین کی فہرست میں خاصا اہم ہے انگریزوں نے ۱۹۳۸ء - ۱۹۴۰ء کے دوران دین فقیر کی جہادی فعالیت کے علاقوں مرمند ' سورغر رگبر' خیسرائی ' پنگ اور پیر تنگی پر مسلسل بمباریاں کیں -

یا غستانی علاقوں میں یہ تحریکیں ہماری تاریخ کا ایک اہم باب ہیں اور اس خطے کی معاصر سیاست اور علاقے کے باشندوں کے اذہان پر ان کے دیرپا اثرات سے انکار ممکن نہیں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اگر یہ پہاڑی مزاحمتی تحریکیں نہ چلتیں تو شاید انگریز ۱۹۴۷ء کے بعد بھی برصغیر سے دستبردار ہونا پسند نہ کرتا - ھندوستان کے میدانی علاقوں میں حصول حریت کے لئے جس جمہوری اور آئینی جد و جہد کی داغ بیل ڈالی گئی اس پر بھی یا غستانی مزاحمتی جد و جہد کے اثرات سے انکار نہیں کیا جا سکتا - انگریزی اقتدار کے خلاف پر امن مقاومت میں ھندوستان کے عوام کی بھرپور شرکت کے سلسلے میں یا غستانی جہاد کا کردار خاصا اہم رہا کیونکہ ان پہاڑی علاقوں میں لوگوں نے اس وقت فرنگی اقتدار کو چیلنج کیا جب دیگر علاقوں میں ان کی اجتماعی مخالفت کا تصور بھی محال تھا -

نزلہ کُشتن روزِ اوّل

گلے میں خراش محسوس ہو یا چھینکیں آنا شروع ہوں تو سمجھ لیجیے کہ نزلہ زکام کی آمد آمد ہے۔ اسے معمولی بیماری سمجھ کر نظرانداز نہ کیجیے۔ فوری جوشینا لیجیے ورنہ زکام، کھانسی اور بخار جیسے تکلیف دہ امراض لاحق ہونے کا اندیشہ ہے۔

جوشینا۔ صدیوں سے استعمال ہونے والے جوشاندے کے نہایت مؤثر، کافی و شافی قدرتی اجزا کا خُلاصہ (ایکسٹریکٹ) ہے جو ہمدرد کے ماہرینِ فن نے سال ہا سال کے تجربات و تحقیق کے بعد جدید دور کے مصروف انسان کے لیے تیار کیا ہے تاکہ اسے جوشاندے کو ابالنے، چھاننے اور شکر ملانے کی زحمت نہ کرنی پڑے۔ ایک پیکٹ جوشینا ایک کپ گرم پانی میں ڈالیے فوری استعمال کے لیے جوشاندے کی ایک خوراک تیار ہے۔

ہمدرد کی فنّی محنت اور دوا سازی کی صلاحیت کا مظہر

Adarts-JOS-1/89

شفیق الدین فاروقی

دارالعلوم کے شب و روز

○ امسال بھی حسب معمول جنوری کے دوسرے عشرے میں دارالعلوم حقانیہ کے تمام درجات کے سالانہ امتحانات منعقد ہوئے حضرت مولانا انوارالحق کی سرپرستی میں امتحانی کمیٹی، انتظامیہ اور اساتذہ کرام نے امتحانات کے معاملات میں باہمی اتفاق رائے سے اہم فیصلے کئے اور اپنی مفوضہ ذمہ داریاں باحسن وجوہ انجام دیں۔
اسی ماہ وفاق المدارس العربیہ کے زیر اہتمام امتحانات کا انعقاد ہوا شیخ الحدیث حضرت مولانا امان اللہ صاحب مدظلہ کی نگرانی میں وفاق کے مرکز سے متعین کردہ باہر کے نگران اساتذہ کرام تشریف لائے امتحانات ہفتہ بھر جاری رہے جامع مسجد دارالعلوم امتحان گاہ تھی۔

○ ۲۷ جنوری کو حسب روایت دارالعلوم حقانیہ میں ختم بخاری کی تقریب منعقد ہوئی کسی پیشگی اطلاع اور اعلان کے بغیر ختم بخاری کی یہ تقریب ایک عظیم کانفرنس کا روپ دھار گئی جامع مسجد کے وسیع صحن، باہر کے چمن، دارالعلوم کے ساتھ متصل ذیلی سڑک، مختلف احاطہ جات، درسگاہیں، احاطوں کے صحن، برآمدول کی چھتیں غرض کہیں بھی تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی دارالعلوم کے اساتذہ اور طلبہ کے علاوہ اکابر اہل علم، بعض افغان رہنما، بعض عرب زعماء، معززین شہر، دور دراز سے آنے والے طلبہ دارالعلوم کے والدین، غرض انسانوں کا سیلاب تھا جو امنڈ آیا تھا بعد از نماز ظہر شیخ الحدیث حضرت مولانا مفتی محمد فرید مدظلہ نے بخاری شریف کی آخری حدیث کا درس دیا دارالعلوم کے مہتمم حضرت مولانا سمیع الحق مدظلہ نے الوداع ہونے والے طلبہ ان کے والدین اور جملہ حاضرین سے مفصل خطاب فرمایا انہوں نے فارغ التحصیل ہونے والے طلبہ کو مستقبل کی ذمہ داریوں، فرائض اور لائحہ عمل کے بارے میں ہدایات دیں ان کے والدین کو اپنے بچوں کو دینی تعلیم کے لیے وقف کر دینے اور تحصیل علم کی تکمیل تک ان کے تعاون پر مبارک دی، ملک کی سیاسی صورت حال، دینی اضمحلال اخلاقی زوال، عالم اسلام کی زبوں حالی، امریکی پالیسی اور عالم اسلام کے فرائض اور تازہ ترین صورت حال پر مفصل تبصرہ کیا۔ اجلاس کا منظر دیدنی تھا۔ طلبہ کو مادر علمی سے جدائی اور فراق کے احساس نے نڈھال کر رکھا تھا۔ عامۃ المسلمین عالم اسلام کی زبوں حالی پر ماتم کناں تھے بار بار اجتماع سے سسکیوں اور رونے کی آوازیں بلند

بلند ہوتی رہیں، آخر میں تمام عالم اسلام، افغان مجاہدین بوسنیا اور کشمیر کے مسلمانوں بالخصوص دارالعلوم کے بانی و سرپرستوں، اراکین، معاونین مخلصین اور عامۃ المسلمین کے لیے بڑے خشوع اور الحاح کے ساتھ دعائیں مانگی گئیں علماء مشائخ طلباء اور صالحین کے اس اجتماع میں ایک کے لیے یہ اطمینان ہی ایک عظیم تحفہ تھا کہ اسے یقین تھا کہ اس عظیم اجتماع میں اس کی دعا بھی یقیناً قبول ہوگئی ہے۔

○ چھ فروری کو دارالعلوم کے مہتمم حضرت مولانا سمیع الحق مدظلہ نے آل پارٹیز کشمیر کانفرنس کی دعوت پر جماعت کے دوسرے رہنماؤں، مولانا قاضی عبداللطیف مدظلہ، مولانا نصیرالدین نقشبندی مدظلہ اور مولانا بشیر احمد شاد کی معیت میں اجلاس میں شرکت کی اور خطاب فرمایا انہوں نے اپنی تقریر میں کہا " افغانستان کی طرح مسئلہ کشمیر کا حل بھی جہاد ہی سے ہوگا استقامت اور جہاد کی وجہ سے افغانستان کا مسئلہ حل ہوا اور جارح دشمن نہ صرف نامراد لوٹا بلکہ خود اپنے بھی ٹکڑے کروا بیٹھا ہمیں جہاد کے نام سے ندامت نہیں ہونی چاہیئے۔ انہوں نے کہا لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانیں گے بھارت کا علاج صرف جہاد ہے انہوں نے اپنی تقریر میں اقوام متحدہ کے دوہرے کردار کی پُرزور مذمت کی انہوں نے حکومت سمیت تمام سیاسی قائدین پر زور دیا کہ وہ اس مسئلہ کو بھی عالم اسلام کے مسئلہ کے طور پر متعارف کرائیں اور پوری اسلامی دنیا کو اپنا ہمنوا بنائیں انہوں نے پاکستان کے کمزور کردار کی مذمت کی اور کہا کہ کشمیر کے بارے میں پاکستان کا کردار موثر نہیں رہا ہے انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ کشمیر میں مشترک قیادت سامنے لائی جائے ورنہ خدانہ کرے پھر انہی نتائج کا سامنا کرنا پڑے جو افغانستان میں سامنے آرہے ہیں۔

○ اس سال بھی حسب سابق دارالعلوم میں دورۂ تفسیر کے پڑھانے کا اہتمام ہے جسے دارالعلوم کے اساتذہ مولانا مفتی غلام الرحمٰن صاحب اور مولانا عبدالقیوم حقانی صاحب پڑھا رہے ہیں طلبہ کی تعداد پونے تین سو ہے جبکہ عامۃ المسلمین، مستفیدین اس پر مستزاد ہیں دارالحدیث کھچا کھچ بھرا رہتا ہے دن کو قرآن کا ترجمہ و تفسیر اور رات کو شعبہ حفظ و تجوید کے حفاظ و قراء اکوڑہ سمیت علاقہ بھر کی مساجد میں تراویح میں قرآن سناتے ہیں دارالحفظ کے برکات میں ایک یہ بھی ہے کہ علاقہ بھر میں شاید ہی کوئی مسجد ہو جہاں تراویح میں قرآن سننے کا اہتمام نہ کیا گیا ہو۔

خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں

عبدالقیوم حقانی

تعارف و تبصرۂ کتب

مولانا غلام رسول مہر اور پاکستان اسکیم | مصنف پیر علی محمد راشدی ۔ صفحات ۱۵۰ قیمت درج نہیں
ناشر : مجلس یادگار مہر ۔ کراچی ۷۵۸۰۰

مولانا غلام رسول مہر ملک کے نامور صحافی ادیب اور مورخ تھے ۔ پیر علی محمد راشدی نے ان کے بارے میں ایک قرن سے زیادہ عرصے کے مشاہدات و تاثرات کو اس کتاب کے نو ابواب میں بیان کیا ہے اس سلسلے میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ نہایت اہم ، معلومات افزا ، فکر انگیز اور ایک دور کی تاریخ ہے اور جو معلومات اس میں ملتی ہیں وہ کسی اور کتاب یا مضمون میں نہیں مل سکتیں ۔

اس کتاب کی ایک چیز وہ " پاکستان اسکیم " ہے جو مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کی مقرر کردہ ایک سب کمیٹی نے تیار کی تھی اس کمیٹی کے چیئرمین سیٹھ حاجی سر عبداللہ ہارون ، سیکرٹری پیر علی محمد راشدی اور اس کے ارکان میں سب سے زیادہ فعال رکن مولانا غلام رسول مہر تھے بعد میں مسلم لیگ کے صدر نے یہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا کہ مسلم لیگ نے کسی کمیٹی سے کوئی اسکیم بنوائی تھی لیکن اب یہ اسکیم جو سولہ صفحوں پر مشتمل فل اسکیپ سائز پر انگریزی ٹائپ میں دستیاب ہو گئی ہے اور پہلی بار اس کتاب میں اصل انگریزی مع اردو ترجمے کے شائع ہوئی ہے ۔

لیکن نہایت حیران کن تاریخ کا یہ انکشاف ہے کہ مسلم لیگ کی یہ سب کمیٹی اس وقت کے وائسرائے ہند لارڈ لن لتھگو کے ایما پر بنائی گئی اور مسلم لیگ کے تین اہم لیڈروں نے جن کا تعلق پنجاب ، بنگال اور بمبئی سے تھا کمیٹی کے قیام کے دوسرے اور تیسرے روز وائسرائے کو اس سے مطلع کر دیا تھا اور اس نے اپنی رپورٹ میں اس کارروائی سے برطانوی کابینہ کے وزیر ہند (لندن) کو اطلاع دی تھی ۔

یہ کتاب پیر علی محمد راشدی کی شخصیت و خدمات اور مولانا مہر کے سوانح ، نو ابواب ، دو ضمیموں اور ایک استدراک پر مشتمل ہے ۔ تالیف و تدوین کا یہ کارنامہ ملک کے مشہور ادیب و محقق ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری نے انجام دیا ہے اس کتاب میں بلاشبہ قرار داد لاہور پر پہلا بے لاگ تبصرہ اور بعض چونکا دینے والے حقائق ہیں ۔

کتاب سفید کاغذ پر چھپی ہے کتابت معیاری اور طباعت عمدہ ہے جلد پختہ اور ڈسٹ کور خوبصورت ہے۔ اور مکتبہ شاہد۔ علی گڑھ کالونی کراچی ۵۸۰۰ ، سے بچھتر (۷۵/-) روپے میں منگوائی جا سکتی ہے۔

عقل کا دائرہ کار از مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم۔ صفحات ۳۶ ۔ قیمت
میمن اسلامک پبلشرز ۱/۱۸۸ لیاقت آباد کراچی ۱۹

یہ جناب حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم کا ایک خطاب ہے جو انہوں نے "دعوۃ اکیڈمی" اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد میں ججوں اور وکلاء کے سامنے کیا تھا۔ جس میں اسلامائزیشن کی ضرورت اور اسلام اور عقل کا تقابل، عقل کی حدود اور اس کی فریب کاریاں اور اس کے مقابلے میں وحی الٰہی کی ضرورت اور اس کی رہنمائی کو تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا تھا۔ اس خطاب کو حضرت مولانا عبداللہ میمن صاحب نے قلم بند کیا جس کو افادہ عام کے لیے "میمن اسلامک پبلشرز" نے خوبصورت ٹائیٹل اور کمپیوٹر کمپوزنگ کے ساتھ شائع کیا ہے اور یہ رسالہ ان لوگوں کے حق میں زیادہ مفید ہے جو اسلام کے مقابلے میں عقل کو پیش کرتے ہیں۔

کاغذی نوٹ اور کرنسی کا حکم از مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم صفحات ۹۰ قیمت ۲۰ روپے
میمن اسلامک پبلشرز ۱/۱۸۸ لیاقت آباد کراچی ۱۹

موجودہ رائج شدہ کرنسی نوٹ کی فقہی حیثیت کے بارے میں علماء کے درمیان کافی اختلاف پایا جاتا ہے اور اسکی فقہی حیثیت کی تعیین کے بعد ہی اس سے متعلق بہت سے فقہی مسائل اور احکام کا شرعی حل نکلتا ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہ نے عربی زبان میں اس مسئلہ پر ایک تفصیلی فقہی مقالہ تحریر فرمایا یہ فقہی مقالہ "اسلامی فقہ اکیڈمی" جدہ کے اجلاس میں پڑھا گیا اور دنیا کے اکثر چیدہ چیدہ فقہاء نے اس کی تائید کی۔ اب یہ فقہی مقالہ "احکام الاوراق النقدیہ" کے نام سے مکتبہ دارالعلوم کراچی سے شائع ہو چکا ہے۔

افادہ عام کے پیش نظر مولانا عبداللہ میمن صاحب نے اس مقالے کو اردو میں منتقل کر دیا۔ چنانچہ خوبصورت ٹائیٹل اور کمپیوٹر کمپوزنگ کے ساتھ "میمن اسلامک پبلشرز" نے اس کو شائع کر دیا ہے اللہ تعالیٰ اس کو نافع اور مفید بنائے اور فائدہ عام اور عام فرمائے۔ آمین

العطور المجموعہ ترتیب : حضرت مولانا صوفی محمد اقبال صاحب مدنی۔ صفحات ۴۰۰ قیمت ۱۳۵
ناشر : مدینہ سٹیشنری مارٹ ۱۸۰ ، انارکلی لاہور

پیش نظر کتاب "العطور المجموعہ" کا جدید بیرونی ایڈیشن ہے جسے بزرگ عالم دین شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریاؒ کے خلیفہ اجل حضرت مولانا صوفی محمد اقبال صاحب مدظلہ نے "نشر الطیب" اور "فضائل نبوی" سے مرتب کیا ہے نشر الطیب کی تسہیل کے ساتھ اپنی روح پرور اور ایمان آفرین تحریر میں عشق و اطاعت

رسول کے مضامین شریک کر کے اس کی تاثیر کو دوبالا کر دیا ہے جس کے مطالعہ سے عظمت رسول منصب نبوت پر اعتماد، اطاعت و انقیاد، درود شریف سے محبت اور ذکر آنحضرت کے جذبات کی انگیخت ہوتی ہے اُردو آسان، سلیس، دلنشین اور واقعات جان گداز، اگر تعلیم کے حلقوں اور مطالعاتی سوسائٹی میں "العطور المجموعہ" کو بھی رواج دے دیا جائے تو انقلابی اثرات ظاہر ہوں گے۔ کتاب کے آغاز میں حضرۃ العلامہ مولانا قاضی محمد زاہد الحسینی، حضرت مولانا پروفیسر محمد اشرف سلیمانی، حضرت مولانا عبدالحفیظ مکی، حضرۃ مولانا حبیب اللہ مظاہری کے تقاریظ ہیں جو اپنے مضامین کے اعتبار سے مستقل مقدمہ ہیں۔ کتاب کے ناشر حضرت مولانا عبدالحفیظ مکی صاحب ہیں جنہوں نے صرف کثیر سے کتاب کو بیروت کے "دار البشائر الاسلامیہ" سے عمدہ کاغذ، شاندار طباعت اور معیاری جلد بندی کے ساتھ طبع کرایا ہے مرتب و ناشر دونوں کو اللہ جزائے خیر دے اور آئندہ بھی اس طرح شاندار عمدہ تالیفات و اشاعت کی توفیق رفیق فرمادے۔ واجرھم علی اللہ۔

مکاتیب شیخ الحدیثؒ

دارالعلوم حقانیہ کے بانی و موسس محدث کبیر شیخ الحدیث حضرۃ مولانا عبدالحقؒ نے اپنی زندگی میں عمومی موضوعات سے خصوصی معاملات تک بے شمار مکاتیب اپنے احباب، معاصرین تلامذہ و متعلقین کو لکھے ان کے گرانقدر مکاتیب بھی اگر چھپ جائیں تو علم و فن اور رہدایت و تعلیم کے کئی رہنما خطوط متعین ہو سکتے ہیں اس وقت درخواست یہ ہے کہ جن حضرات کے پاس بھی حضرت شیخ الحدیثؒ کے مکاتیب ہوں وہ اسکی فوٹوسٹیٹ کاپیاں اور اگر ہو سکے تو مختصراً اس کا پس منظر بھی لکھ کر بھیج دیں تاکہ ترتیب و اشاعت کا کام شروع ہو سکے یہ علمی امانت ہے اسے جس قدر پھیلایا جائے صدقہ جاریہ ہے خصوصی معاونت پر شکر گذار رہوں گا۔

عبدالقیوم حقانی

موتمر المصنفین، دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک ضلع نوشہرہ

فرمانِ رسول..

حضرت علی ابن ابی طالب کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"جب میری اُمّت میں چودہ خصلتیں پیدا ہوں تو اس پر مصیبتیں نازل ہونا شروع ہو جائیں گی"
"دریافت کیا گیا یا رسول اللہ! وہ کیا ہیں؟ فرمایا:

- جب سرکاری مال ذاتی ملکیت بنا لیا جائے۔
- امانت کو مال غنیمت سمجھا جائے۔
- زکوٰۃ جرمانہ محسوس ہونے لگے۔
- شوہر بیوی کا مطیع ہو جائے۔
- بیٹا ماں کا نافرمان بن جائے۔
- آدمی دوستوں سے بھلائی کرے اور باپ پر ظلم ڈھائے۔
- مساجد میں شور مچایا جائے۔
- قوم کا رذیل ترین آدمی اس کا لیڈر ہو۔
- آدمی کی عزت اس کی برائی کے ڈر سے ہونے لگے۔
- نشہ آور اشیاء کھلم کھلا استعمال کی جائیں۔
- مرد ابریشم پہنیں۔
- آلات موسیقی کو اختیار کیا جائے
- رقص و سرود کی محفلیں سجائی جائیں
- اس وقت کے لوگ اگلوں پر لعن طعن کرنے لگیں۔

تو لوگوں کو چاہیئے کہ پھر وہ ہر وقت عذاب الٰہی کے منتظر رہیں خواہ سرخ آندھی کی شکل میں آئے یا زلزلے کی شکل میں یا اصحاب سبت کی طرح صورتیں مسخ ہونے کی شکل میں۔ (ترمذی ۔ باب علامات الساعۃ)

—— منجانب ——

AL-HAQ

محدث کبیر قائد شریعت شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق ؒ بانی و موسس دار العلوم
حقانیہ اکوڑہ خٹک کے علمی و عملی کمالات اور سیرت و سوانح پر مشتمل عظیم تاریخی دستاویز

ماہنامہ الحق کا شیخ الحدیث مولانا عبدالحق ؒ نمبر

ایک عہد ایک تحریک اور ایک تاریخ

اس نمبر کے لکھنے والوں میں اکابر علماء دیوبند، اساتذہ علم و مشائخ کبار، معروف دینی مجلوں کے مدیر، ہفت روزوں اور اخبارات کے ایڈیٹر اور صحافی ملک و بیرون ملک کے عظیم سکالرز، محقق مصنفین و شیوخ حدیث، متعدد مورخین و ادباء افغان عبوری حکومت کے سربراہ سمیت افغان جہاد کے تمام قائدین محاذ جنگ کے متعدد جرنیل، سابق اور موجودہ حکمرانوں کے اعتراف عظمت پر مبنی تقریریں اور تحریریں سیاست دانوں کا خراج عقیدت اور متعدد زعماء کے مفصل بیانات ۔ غرض اپنے موضوع اور جامعیت کے اعتبار سے ایک مثالی شاہکار تقریباً ایک ہزار صفحات پر مشتمل، بہت جلد ہی منظر عام پر آرہا ہے۔ انشاءاللہ
بہترین کتابت، عمدہ طباعت، مضبوط ڈائی دار سنہری جلدیں ماہنامہ "الحق" کے مستقل قارئین اور نئے بننے والے خریداروں کے لیے ۳۲ ، فی صد کی خصوصی رعایت۔

اصل قیمت ۲۵۰ روپے خصوصی رعایت ۱۷۰ روپے

وی پی نہیں کیا جائے گا۔ پیشگی رقم بھیجنے والوں کو رجسٹرڈ پارسل کے ذریعہ بھیجا جائے گا۔

ماہنامہ الحق دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک ضلع نوشہرہ